سہ ماہی برقی مجلہ
ارمغانِ ابتسام
اکتوبر ۲۰۱۲ء تا دسمبر ۲۰۱۲ء

حضرت عبداللہ بن حارث بیان کرتے ہیں کہ
میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کسی کو مسکراتے
ہوئے نہیں دیکھا۔
سنن الترمذی رقم الحدیث ۳۶۴۱ : مسند احمد ج ۴ ص ۱۹۰ اور
۱۹۱ : شرح السنہ رقم الحدیث ۳۵۹۶۔

مُدیر

امین محمود

مشاورت

نوید ظفر کیانی

روبینہ شاہین

ارمغان ابتسام

https://www.facebook.com/groups/837838569567305/

کیا کیا کہاں کہاں

غزلیات

خصوصی گوشہ

نظمالوجی

سرگوشیاں

اُردو ادب اور فیس بک کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ شاعر روزِ آفرینش سے قلم سونتے کتابی چہروں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور ''میں پھروں قریہ بہ قریہ کو بکو تیرے لئے'' کی گردان کرتے ہوئے مسلسل آوارگی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اب جانکاری کی صنعت والوں نے اس کتابی چہرے یعنی face book کو اُن کے اپنے گھروں میں پہنچا دیا ہے اب وہ فیس بک کی دیوارِ گریہ پر اپنی تصویریں تھاپتے پھر رہے ہیں۔

فیس بکیوں اور پرانے زمانے کے محبوباؤں میں ایک بات مشترک ہے' وہ یہ ہے کہ دونوں پردہ نشین ہیں۔ پہلے حُسن برقعوں میں خُفتہ رہتا تھا جبکہ دورِ حاضر میں کیا حُسن اور کیا عشق' دونوں نے IDs کے برقعے پہن رکھے ہیں۔ کوئی پتہ نہیں کہ کس آئی ڈی کے پیچھے کون ہے۔ کبھی گل شیر خان مٹک کر "ہائے اللہ" کہہ اُٹھتا ہے تو کبھی احساسیت کو سلمٰی خاتون کی مونچھیں چبھنے لگتی ہیں۔ بے شک اللہ ہی دلوں کا حال جاننے والا ہے۔

فیس بک پر اِن دنوں فی البدیہہ آن لائن مشاعروں کی بیٹھکیں بھی خوب جم رہی ہیں۔ بے شمار گروہ محض ہفت روزہ فی البدیہہ طرحی مشاعروں کے لئے مختص ہیں۔ شاعر کم ٹائپسٹ دھڑا دھڑ مشقِ سخن فرماتے ہیں اور کھٹا کھٹ غزلیں پوسٹ کرتے جاتے ہیں۔

ایک کمی رہ گئی تھی اور وہ تھی برقی ادبی مجلّے کی سو یہ تہمت فدوی کے سر گئی۔ جب مابدولت نے "ارمغانِ ابتسام" کا قصد کیا اور اس نام سے فیس بک پر ایک عدد گروہ بھی پیدا فرمادیا تو خاصا اچھا ریسپانس ملا۔ بہت سے ادباء اور شعراء نے ہمیں اپنے قلمی تعاون کا یقین دلایا۔ اُردو طنز و مزاح کی مجلسِ منتظمین کا رکن ہونے کی حیثیت سے ہم نے نوید ظفر کیانی صاحب پر بھی ڈورے ڈالے اور انہیں بھی مشاورت پر آمادہ کرلیا۔ اِسی گروہ کی ایک خاتون منتظمہ بھی مشاورت اور تخلیقات کی صورت میں تعاون پر آمادہ ہو گئیں' یوں لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔

مجلّہ ھٰذا نہ صرف اپنی نوعیت کی اولین کاوش ہے بلکہ اپنی مخصوص ہیئت کی وجہ سے خاصی بے نظیر بھتُو بھی ہے۔ فیس بک پر اُردو طنز و مزاح لکھنے والے اگرچہ زیادہ تعداد میں موجود نہیں ہیں تاہم "جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے"۔ فدوی نے تاکہ لگا کر بیشتر کو چھاپ لیا ہے' جو کمی رہ گئی تھی وہ نوید بھائی نے پوری کر دی۔ وہ بھی اس ضمن میں برابر کے گناہ گار ہیں۔

پائلٹ پروجیکٹ ہونے کے باعث آپ کو اس مجلّہ میں بہت سے خلا نظر آئیں گے تاہم انشاءاللہ آئندہ شماروں میں ایسا نہیں ہوگا۔ میں آپ سب پڑھنے والوں کو کھلے دل سے دعوت دیتا ہوں کہ آپ اپنی بیباکانہ رائے سے مستفید فرمائیں تاکہ اس مجلّہ کو بہتر سے بہتر بنانے کے عمل کو تحریک مل سکے۔

اللہ آپ سب کا حامی و ناصر ہو۔

والسلام

امین محمود

شہرت اور شاعری کی دوڑ

مشفق خواجہ

پچھلے دنوں ایک مشہور شاعر سے ہماری ملاقات ہوئی۔ ہم نے یونہی اخلاقاً اُن سے پوچھ لیا" بہت دِنوں سے آپ کی کوئی تخلیق نظر سے نہیں گزری" انہوں نے یوں ہمیں گھور کر دیکھا جیسے ہم نے کوئی بداخلاقی کا ارتکاب کیا ہو۔ پھر قدرے غصے سے فرمایا"معلوم ہوتا ہے کہ اخبارات آپ کی نظروں سے نہیں گزرتے"۔ہم خاموش رہے۔انہوں نے ہماری خاموشی کو لاعلمی سمجھتے ہوئے اس کے ازالے کے لئے فرمایا: اگر آپ اخبار دیکھتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ اس سال سب سے زیادہ تخلیقی کام میں نے کیا ہے۔ میرے سات انٹرویو چھپے ہیں۔ بائیس خبریں میرے حوالے سے شائع ہوئی ہیں اور بیشمار ادبی رپوٹوں میں میرا ذکر موجود ہے"۔

اب ہمارا خاموش رہنا ممکن نہ تھا۔ عرض کیا" یہ تو سب ٹھیک ہے لیکن یہ بتایئے کہ آپ کی کوئی نظم یا غزل بھی شائع ہوئی؟" انہوں نے فرمایا" نظم یا غزل کی اشاعت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اصل چیز یہ ہے کہ شاعر خود شائع ہو۔اب یہی سب سے بڑا تخلیقی کام ہے"۔

بات سچی تھی' اس لئے ہم نے بحث کو آگے نہ بڑھایا۔ بحث کو ہم آگے بڑھا بھی کیسے سکتے تھے کہ پچھلے دو مہینوں میں شاعرہ پروین شاکر کے بارے میں اخبارات میں اتنا کچھ شائع ہوا ہے جس سے ہمیں یقین آ چکا ہے کہ اب فن سے زیادہ فنکار کی اہمیت ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو شاعرہ موصوفہ سلمہ کی تین درجن سے زیادہ رنگین اور بلیک اینڈ وائٹ تصویریں' اتنی ہی ان کے حوالے سے خبریں اور ادبی رپورٹیں اور پانچ چھ انٹرویو ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ اس دشت کی سیاحی کچھ افتخار عارف کو ہی راس آئی ہے' لیکن اب معلوم ہوا کہ افتخار عارف شاعری اور مشاعروں میں کتنے ہی آگے نکل جائیں' پبلک ریلیشنگ میں ابھی گھٹنوں کے بل چل رہے ہیں۔ انہیں تو تصویر کھنچوانے کا ڈھنگ نہیں آتا تو چھپوانے کا کیا آئے گا۔

یہ بات ہم نے اِس لئے کہی ہے کہ اب تک افتخار عارف کی جتنی بھی تصویریں ہماری نظر سے گزری ہیں ان میں وہ شرمائے شرمائے سے نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ ساری تصویریں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کھینچی ہوں۔ لیکن ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تصویریں نہیں کھینچتے' دامنِ تنقید کو حریفانہ کھینچتے ہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے افتخار عارف کی جو تصویریں دیکھی ہیں وہ اُن کی شاعری پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے مضمون کی اشاعت کے بعد کی ہوں۔

ہم معذرت خواہ ہیں کہ تمہید خاصی طویل ہو گئی۔اِس سے پہلے کہ یہ کالم تمہید ہی تمہید میں اپنے انجام کو پہنچے' ہمیں اپنے موضوع کے انجام کی فکر کرنی چاہیئے۔

سناؤ سناؤ...... پوری غزل سناؤ تاکہ تمہاری قبض ٹوٹے اور میری جان چھوٹے!!

حال ہی میں ایک اخبار میں پروین شاکر کا ایک دلچسپ انٹرویو چھپا ہے' اِتنا دلچسپ کہ اس کے سامنے شاعرہ کا تازہ مجموعہ " خود کلامی " اچھی خاصی تلخ کلامی نظر آتی ہے۔

محترمہ سے سب سے پہلا سوال امجد اسلام امجد نے کیا جو یہ تھا۔ "قیامِ پاکستان کے بعد جن لوگوں کو ادبی لحاظ سے شہرت ملی ان میں پروین شاکر کا نام سرِفہرست ہے سو مجھے پروین شاکر سے پوچھنا یہ ہے کہ آپ کا جو فنی ارتقاء ہے اس میں یہ دباؤ یا پریشر جو شہرت کا ہوتا ہے' اس نے آپ کو کہاں تک مدد دی ہے ؟"۔

اگر سائل یعنی دستِ سوال دراز کرنے والے تو قیامِ پاکستان کے بجائے 1857 کی جنگِ آزادی سے بات شروع کرتے کیونکہ ہماری سیاسی جدوجہد کا آغاز 1857 ہی سے ہوتا ہے۔ قیامِ پاکستان تو اس جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رہنا چاہیئے کہ قیامِ پاکستان کو حد قرار دینے سے شہرت کا دورانیہ مختصر ہو جاتا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد فلاں شاعر سے بہتر شاعر پیدا نہیں ہوا' تو اس بات میں اِتنا اثر نہیں ہوگا جتنا اس میں کہ 1857 کے فلاں شاعر سے بہتر......

خیر یہ تو ایک نظریاتی بحث تھی' ہمیں امجد اسلام امجد کا سوال پسند آیا' شہرت کے دباؤ کے تحت شاعری کرنا بالکل نئی بات ہے۔ یہ تو سنا تھا کہ بعض لوگ حالات کے دباؤ کے تحت غلط کام کرتے ہیں۔ یہ اب معلوم ہوا کہ شہرت کے دباؤ کے تحت بھی بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ ان جملہ ہائے معترضہ کے بعد اب آپ شاعرہ کا جواب بھی ملاحظہ فرمایئے " میرے خیال میں شہرت ذرا پہلے میرے گھر چل کر آ گئی تھی' اس کو دیر سے آنا چاہیئے تھا...۔ جلد شہرت ملنے میں نفع و نقصان دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ فائدے کا پلہ بھاری رہتا ہے"۔

ہمیں اس سے اتفاق نہیں تھا کہ شہرت کو دیر سے آنا چاہئے تھا۔ اگر شہرت دیر سے آتی تو شاعری بھی دیر سے شروع ہوتی۔ مجموعے بھی دیر سے چھپتے۔ گویا معاملہ بیسویں صدی کے اختتام یا اکیسویں صدی کے شروع تک پہنچ جاتا۔ ظاہر ہے اس وقت تک ہم جیسے عمر رسیدہ اور سرد و گرم زمانہ چشیدہ سامعینِ ادب کی دائمی مفارقت کو ایک عرصہ گزر چکا ہوتا۔ لہذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قبل از وقت شہرت سے ادب کو فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو' ہم جیسے شائقینِ ادب کو ضرور فائدہ پہنچا ہے کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ شہرت کا دباؤ کیا ہوتا ہے اور شہرت اور شاعری کی دوڑ میں شہرت کس طرح آگے نکل جاتی ہے۔

رہی نفع ونقصان کی بات تو ہماری رائے تو یہ ہے کہ جب خود شاعری ہی نفع بخش کام نہیں ہے تو اس کے ذریعے حاصل کہ ہوئی شہرت کو نفع ونقصان کے پیمانوں سے ناپنا درست نہیں۔ شہرت کے سلسلے میں ہمیشہ یہی اصول ہونا چاہئے کہ جیسی ملے' جہاں سے ملے' جس قدر ملے' قبول کر لینی چاہیئے۔

ایک سوال کے جواب میں شاعرہ نے کہا" بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے شاعر بڑے غیر ذمہ دار ہیں۔ گھر میں بھی اور باہر بھی۔اسی وجہ سے اِن کا امیج خراب ہوا ہے"۔ ہم شاعر نہیں ہیں' لہذا اس الزام کی تردید یا تائید کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں۔ تاہم اس قدر ضرور عرض کریں گے کہ محترمہ اگر اپنی برادری کے بارے میں اتنی سخت الزام تراشی سے اجتناب کریں تو بہتر تھا۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ ہم بعض شاعروں کو جانتے ہیں جو اس حد تک ذمہ دار ہیں کہ گھر میں یا گھر سے باہر اپنی کسی حرکت سے شاعر معلوم نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ اُن کی شاعری سے بھی ان کے شاعر ہونے کی تصدیق نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے سوال کیا: "آپ کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ۔۔۔۔۔۔ آپ کالج کی لڑکیوں کی شاعرہ ہیں اگر اس کو آپ کی شاعری پر بطور لیبل چسپاں کیا جائے تو آپ اس سے کس حد تک مطمئن ہیں؟ شاعرہ نے جواب دیا: "خوشبو میں زیادہ تر نظمیں ایسی ہیں جو نوجوان نسل کی نمائندگی کرتی ہیں' لیکن جو اس کی بعد کی نسل کے لوگ ہیں ان کو میں کبھی اپنی شاعری سے بددل نہیں دیکھا"۔

اس پر ہمیں ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ بلا تشبیہ عرض ہے کہ ایک شاعر نے ایک مشاعرے میں اپنا کلام سُنایا' سامعین میں سے کوئی دل گرفتہ رونے لگا۔ شاعر نے اس سے کہا: " کیا آپ میری شاعری سے بددل ہو گئے ہیں"؟ اُس شخص نے جواب دیا: "آپ کی شاعری سے نہیں' میں زندگی سے بددل ہو گیا ہوں کہ کیسا کیسا کلام سننا پڑتا ہے"۔

عطاالحق قاسمی نے سوال کیا: " خُوشبو آپ کی پہلی کتاب تھی۔ اس میں آپ نے بہت ساری چیزیں رد کی تھیں یا ساری کی ساری شامل کر دی تھیں"؟ اس کے جواب میں پروین شاکر نے بتایا کہ انہوں نے اپنی بہت سی تخلیقات رد کی ہیں اور انہیں "خُوشبو" میں شامل نہیں کیا۔ اِس پر عطاالحق قاسمی نے کہا: "شاعر کو یہ حق ہوتا ہے کہ لوگوں کے سامنے اپنی چیزیں پیش کرنے سے پہلے خود ہی ان کو رد کر دے"۔

یہاں بھی ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے۔ ایک شاعر نے اپنا مجموعہ کلام ایک نقاد کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا: "میں اپنا آدھا کلام رد کر دیا ہے اور آدھا اس مجموعے میں شامل کیا ہے۔ نقاد نے مجموعہ کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا: "یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ پڑھنے والوں کو اس سے بہت سہولت ہو گی کہ انہیں بھی آپ کا آدھا کلام ہی رد کرنا پڑے گا"۔

مجھے تم سے محبت ہے

جوڈو نائیل / نوید ظفر کیانی

میں اُس وقت فون پر اپنے دوست "نِک" سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ اپنے دفتر میں تھا اور میں گھر پر تھی۔۔۔ ہم اُسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے جس پر لوگ عموماً گفتگو کیا کرتے ہیں۔۔۔یعنی کسی بھی موضوع پر نہیں۔

وہ مجھے اپنی "اداکاری" کی کلاس کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ہم دونوں نے پروگرام بنایا تھا کہ ہم کوئی مزاحیہ فلم دیکھنے جائیں گے۔ اُس سے فارغ ہو کر ٹی وی پر مشکوک دانشواروں سے حالاتِ حاضرہ و غیر حاضرہ پر ہوائیاں اڑاتے سنیں گے اور پھر مزید سنجیدہ پروگرام یعنی مشہورِ زمانہ کارٹون شو "سمپسن" دیکھیں گے وغیرہ وغیرہ۔

شائد اسی لئے مرد حضرات کو رقص سے دلچسپی ہوتی ہے کیونکہ وہ اس طور پر ُمعنی باتوں سے اجتناب کر کے ایک لمبا وقفہ اُن خواتین کے ساتھ بحفاظت گزار سکتا ہے جو اُن سے تعلقات کے کسی پُر معنی حل پر گفت و شنید کرنا چاہتی ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ مجھے شدید دھچکا لگا جب باتوں کے دوران نِک نے میری بات کاٹی اور کہا" آئی لویُو " اور پھر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں سُن ہو کر رہ گئی۔۔۔۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم بہت پرانے دوست تھے۔۔۔ اتنی کہ میں اُس کی شادی کے موقع پر پیش پیش رہی تھی۔۔۔ لیکن مجھے اس امر کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ وہ میرے متعلق اِس انداز سے سوچتا ہے۔۔۔ اُس نے تو اظہار محبت کے ضمن میں اُن تمام ضمنی اقدامات کو نظرانداز کر دیا تھا جو اظہارِ محبت کے خمیازے سے پہلے اُٹھائے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ۔۔۔۔ مجھے تمہاری یہ بات پسند ہے یا یہ کہ مجھے تمہارے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا ہے یا پھر یہ کہ تم نے مجھے مکمل کر دیا ہے وغیرہ وغیرہ لیکن یہ ایک دم سے شبخون مارنا کہ " مجھے تم سے محبت ہے" ناقابل فہم بات تھی۔

اُس کے یہ الفاظ اسقدر سرسری انداز میں کہے تھے جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔۔ہیلو' بر گر کھانا ہے؟

واضح طور پر لگ رہا تھا کہ نِک مجھ سے مذاق کر رہا ہے۔۔۔ ابھی وہ مجھے فون کرے گا اور ایک پُرزور قہقہہ لگا کر کہے کہ۔۔۔۔ تم کیا سمجھیں تھیں۔۔۔۔۔۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔۔۔۔۔ ہاہاہاہا۔۔۔۔۔

میں کافی دیر انتظار کرتی رہی۔

(ریکارڈ کے لئے بتائے دیتی ہوں کہ اب مجھے پتہ لگا کہ دل کے معاملات میں سسپنس کتنی بُری شے ہے' خصوصاً صنفِ نازک اس سے کس قدر متاثر ہو سکتی ہیں)۔

ناچار مجھے خود ہی اُسے فون کرنا پڑا۔۔۔۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ اپنی گزشتہ گفتگو کے سلسلے میں میرا ردِ عمل دیکھنا چاہتا تھا۔۔۔ یہی کہ آیا کہ میں نے اس کی بات کا نوٹس لیا ہے یا نہیں۔۔۔۔ جیسے اگر میں کہہ دوں کہ نہیں کیا کہا تھا تم نے تو وہ کہے گا۔۔۔۔ نہیں کچھ نہیں ' میں یونہی پوچھ رہا تھا۔۔۔اور یوں یہ بات آئی گئی ہو جاتی۔۔۔۔ جیسے کبھی وقوع پذیر ہی نہ ہوئی ہو۔

لیکن میں کسی بھی صورت اتنے حساس معاملے پر اُسے یا خود کو لٹکائے رکھنے کی قائل نہیں تھی۔۔۔۔ ایسا واقعہ قسمت کے دروازے پر شاذ و نادر ہی دستک دیتا ہے اور اگر اس معاملے سے یونہی اغماز برتا جاتا تو ہمیشہ کے لئے دل میں ایک پھانس بن کر رہ جاتا۔

میرے استفسار پر اُس نے فوری وضاحت پیش کی۔۔۔۔ اس نے بتایا کہ وہ اس وقت اپنے آفس میں تھا کہ اچانک اُس کا باس کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔۔۔ اُس کے اس طرح اچانک آ جانے سے نِک کنفیوز ہو گیا۔۔۔ چونکہ اس دفتر میں نیا نیا بھرتی ہوا تھا اس لئے نہیں چاہتا تھا کہ اس کا باس یہ تاثر لے کہ وہ اپنے کسی دوست سے فون پر اتنی دیر تک کال کر رہا ہے۔۔۔ اگرچہ بات کچھ ایسی ہی تھی۔

چنانچہ نِک نے اُس کے سامنے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ اپنی بیوی سے بات کر رہا ہے۔۔۔۔ ظاہر ہے کوئی اپنی بیوی سے تو زیادہ بات نہیں کر سکتا۔۔۔۔ مجھ سے اظہارِ محبت کر ڈالا۔۔۔۔۔۔ میرے لئے وہ اظہارِ محبت ہوتا لیکن اُس کی بیوی کے لئے معمول کا ایک سماجی فقرہ۔ اُس دن میں نے یہ ایک سبق سیکھا۔

اگر آپ فون پر بات کر رہی ہوں اور آپ کا بہترین دوست آپ کو کہے کہ "مجھے تم سے محبت ہے" تو زیادہ چونکنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ ممکن ہے کہ اُس کا باس اچانک اُس کے دفتر میں ٹپک پڑا ہو۔۔۔۔۔ ایسی صورتِ حال میں بہتر یہی ہے کہ آپ نہایت سکون کے ساتھ ریسیور کو کریڈل پر رکھیں اور سوچیں کہ دوپہر کے کھانے میں کیا پکانا چاہیئے۔

یہ بھی عین ممکن ہے کہ کوئی آپ سے سیدھے سبھاؤ کہہ دے کہ "مجھے تم سے محبت ہے" لیکن یہ بھی اُس صورت میں ہو گا جب آپ شکاگو سے بھاگم بھاگ گھر کو واپس لوٹ رہی ہوں اور آپ میں سے ایک قریب المرگ ہو۔

باقی تمام دیگر حالات میں ایسا صرف وکٹورین دور کی فلموں میں ہی ممکن ہے۔

مجھے تم سے محبت ہے" ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہوں۔۔۔۔۔۔۔"

(Love is confusing کا ترجمہ)

خوشامد

خادم حسین مجاہد

جب کسی کو الو بنانے کے لئے اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جائیں تو اسے خوشامد کہتے ہیں۔ یہ وہ آرٹ ہے جس میں زہر کی بجائے شہد یا میٹھی چھری سے قتل کیا جاتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس سے انسان نہ صرف ہنسی خوشی قتل ہو جاتا ہے بلکہ قاتل کا ممنون احسان بھی ہوتا ہے حتیٰ کہ اسے اپنے ساتھ ہونے والی واردات کا علم تک نہیں ہوتا۔

خوشامد جھوٹ کی سگی، منافقت کی رضاعی اور مکاری کی چچازاد بہن ہے اس کی اپنے شوہر سے کئی اولادیں ہیں جن میں چاپلوسی، مکھن، چمچہ گیری، کاسہ لیسی، حاشیہ برداری، ٹی سی، پی آر لپ سروس اور جی حضوری شامل ہیں بعض دُم ہلانے والے بھی اس کے رشتہ داروں میں شامل ہیں۔

خوشامد کامیابی کا بین الاقوامی شارٹ کٹ ہے۔ باوا آدم سے لے کر موجودہ زمانے تک اس کے کارنامے جاری ہیں تاریخ کے صفحات اس کی اہمیت کے مستقل گواہ ہیں۔ ابن انشاء کی تحقیق کے مطابق انسان کی پہلے دُم ہوتی تھی جو کثرتِ کار کی وجہ سے جھڑ گئی مگر ہمارے خیال میں یہ دُم اپنے آفیسر کے سامنے زیادہ ہلانے کی وجہ سے جھڑی ہے کیونکہ آج کل دُم نہ ہوتے ہوئے بھی اس قدر دُم ہلائی جاتی ہے کہ بعض دُم دار جانور بھی شرمندہ ہو جاتے ہیں۔

خوشامد کی ایجاد اور سب سے پہلے استعمال کا سہرا شیطان کے سر ہے۔ یہ شیطان کی خوشامد ہی تھی جس سے متاثر ہو کر اماں حوا نے باوا آدم کو شجرِ ممنوعہ چکھنے پر مجبور کیا جس کے نتیجے میں ان کو جنت سے دیس نکالا ملا اور دنیا پر اترنا پڑا۔ گویا اس دنیا کے بسنے میں خوشامد کا کردار مرکزی ہے اسی لئے آج دنیا کے ہر کام کے لئے خوشامد بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شیطان نے خوشامد کا فن آدم و حوا دونوں پر آزمایا مگر مطلوبہ نتائج اماں حوا کی جانب سے ہی حاصل ہوئے شاید یہی وجہ ہے کی آج بھی حوا کی بیٹیاں خوشامد کا جلد شکار ہو جاتی ہیں اس لئے ایماندار اور بااصول افسروں سے کام نکلوانے کے لئے زمانہ شناس لوگ ان کی بیویوں کو تحائف دیا کرتے ہیں اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرد کو راہِ راست سے بھٹکانے میں عورتوں کو یدِ طولیٰ حاصل ہے' اِسی لئے ہم سفارش کرتے ہیں کہ جب ایسے لوگوں کو سزا سنائی جائے تو اس کا کچھ حصہ ان کی بیویوں پر بھی لاگو کیا جائے۔

ماضی بعید سے لے کر ماضی قریب تک ہر قسم کی حکومتوں کے عروج و زوال میں خوشامدیوں کا انتہائی ہاتھ رہا جتنا ہمارے ملکی معاملات میں غیر ملکی ہاتھ ہوتا ہے۔ شاہی درباروں میں معمول کے خوشامدی درباریوں کے علاوہ کچھ خاص قسم کے کاسہ لیس بھی ہوتے تھے جن میں تنخواہ دار علماء شعراء اور مورخین شامل تھے۔ علماء شاہانِ وقت کے ہر عمل کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا کرتے تھے' چاہے وہ سگے بھائیوں کو تہ تیغ کر دیتے سروں کے مینار بنوا دیتے یا دنیا بھر کی حسین لڑکیوں سے حرم بھر لیتے۔ شعراء قصائد میں بادشاہ کی کو ہزار سے ضرب دے کر اور ہر خامی کو ہزار سے تقسیم کر کے بیان کر دیتے تھے۔ بادشاہ کو خدا سے بھی آگے بڑھا دیتے تھے اور موتیوں سے منہ اور جھولی بھر کے لے جاتے تھے۔ مورخین درباری شعراء کا کام نثر میں سرانجام دیتے بادشاہ سلطنتوں کی سلطنتیں تاخت و تاراج کر دیتا تو اسے بہادری قرار دیتے' کسی آوازِ حق کو تلوار سے ہمیشہ کے لئے خاموش کرا دیتا تو معاملہ فہمی اور نظم و ضبط کا نام دیا جاتا' کسی غریب کی کمسن لڑکی داخلِ حرم کر دی جاتی تو اسے غریب پروری لکھا جاتا۔ اگر چنگیز خان اور ہلاکو خان کے درباری مورخین کی دستاویزات مل جائیں تو اُن کے مطابق وہ سب سے زیادہ بہادر، معاملہ فہم، رحم دل اور فیاض قرار پائیں گے۔ علاوہ ازیں خوشامدی درباری ہر وقت بادشاہ کے عدل و انصاف، رعایا پروری اور مساوات کے ڈنکے بجاتے رہتے اور ان کی آنکھوں سے بادشاہ کو ہر طرف سکھ چین نظر آتا شیر بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے دکھائی دیتے یہی سب خوشامدی مل کر ایک دن بادشاہ کو لے ڈوبتے اور نئے بادشاہ کی شان میں رطب اللسان ہو جاتے۔

انگریزوں نے ہندوستان پر قدم جمانے کے لئے تجارت، ذہانت، ٹیکنالوجی اور سیاست کے ساتھ ساتھ خوشامد سے بھی خوب کام لیا۔ انہوں نے بذریعہ خوشامد ہندوستانی بادشاہوں کے دِلوں میں سرنگیں بنائیں اور پھر ان میں چھریاں گھونپ کر ان ریاستوں میں بھی سرنگیں بنالیں اور ان پر اپنے حمایتیوں کو اقتدار دے لیکن، بہت جلد ان کا واسطہ خوسامدیوں سے پڑ گیا۔ انگریز آج تک اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ انہوں نے ہندوستان پر دو سو سال حکومت کی حقیقت یہ ہے کہ اُن کی حکومت محض چند عشرے رہی پھر "خاندانِ خوشامدیہ" بر سرِ اقتدار آگیا جو انگریزوں کا ہی پروردہ تھا۔ انگریز چلے گئے مگر" خاندانِ خوشامدیہ" کی حکومت آج بھی روپ بدل کر قائم و دائم ہے۔

سیاست خوشامد کا دوسرا رخ ہے۔ الیکشن سے قبل امیدوار پہلے پارٹی ٹکٹ کے لئے خوشامد کرتا ہے پھر ووٹ کے لئے عوام کی۔ اس کے سپورٹر حقیقتاً اُس کے خوشامدی ایجنٹ ہوتے ہیں جو اُس کے ممبر بننے کی صورت میں مراعات کے حصول کے لئے اس کی خوشامد میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ بڑی پارٹی حکومت بنانے کے لئے چھوٹی پارٹیوں کو عملی خوشامد کے ذریعے ساتھ ملاتی ہے۔ حکومت کو عوام، انتظامیہ، فوج اور امریکہ کی چہار طرفہ خوشامد کی راہ اختیار کرنا پڑتی ہے کہ اِس کے بغیر حکومت کا استحکام ناممکن سی بات ہے۔

خوشامد کی جڑیں خونی رشتوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جب بچہ چھوٹا ہوتا ہے تو اپنی فرمائشیں پوری کرانے کے لئے ماں باپ کی خوشامد کرتا رہتا ہے' بڑا ہو کر روزگار کے لیے خوشامد کا سہارا لیتا ہے اگر روزگار مل جائے تو رشتہ دار اس کی خوشامد میں مصروف ہو جاتے ہیں کئی خوشامد کی انتہا تک پہنچ جاتے ہیں اور رشتہ تک دے

دیتے ہیں۔ شادی کے بعد وہ بیوی اور سسرال کی خوشامد میں مصروف ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھار بیوی بھی اس کی خوشامد کر لیتی ہے جب اسے کوئی فرمائش پوری کرانی ہو، شاپنگ پہ جانا ہو یا پہلی تاریخ قریب ہو، لیکن زن مریدی عام ہونے کی وجہ سے عورتوں میں خوشامد کی شرح تیزی سے کم ہو رہی ہے۔

صحافت کی رگوں میں بھی خوشامد خون کی طرح دوڑ رہی ہے۔ کچھ اخبار حکومت کی خوشامدی ہوتے ہیں اور کچھ سرمایہ داروں یا جاگیر داروں کی' بعض سب کے خوشامدی ہوتے ہیں اور بعض صرف ایک پارٹی کے کاسہ لیس ہوتے ہیں، اور اس کے عوض اشتہارات، مراعات اور مفادات حاصل کرتے ہیں۔ یہ سب اپنا فرض ادا کرنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں' یہ ہر خبر اور واقعہ کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ان کے سرپرستوں کو آنچ تک نہیں آتی۔ اس مقصد کے لئے یہ جادو بیاں کالم نگاروں سے کالم بھی لکھواتے ہیں اور کچھ خبریں خود گھڑ کر اصلی چھپا بھی لیتے ہیں اور " حق خوشامد" وصول کرتے ہیں۔ اس سب کے باوجود یہ عوامی اخبار کہلاتے ہیں اور عوام کو مطمئن کرنے کے لئے ان کی خوشامد ان کے مسائل کار ونا رو کر کرتے رہتے ہیں۔

تمہاری یہ جرأت کہ مجھے جرأت کے شعر سناؤ!!

ادب اور خوشامد میں بھی خاصے قابل اعتراض تعلقات پائے جاتے ہیں۔ کسی بھی شاعر اور ادیب کی کامیابی میں اس کی محنت کے علاوہ اڈیٹروں سے اس کی پی آر اور اس کے ادبی گروہ کے خوشامدی مضامین کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے جن میں اسے غالب اور اقبال کے پائے کا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہوتی ہے ادبی ایوارڈ، ادبی کانفرنسوں، بین الاقوامی مشاعروں اور غیر ملکی دوروں میں نمائندگی دیتے وقت بھی خوشامد کے میرٹ کا مکمل خیال رکھا جاتا ہے۔ ادبی کتابوں کے دیباچے دراصل مصنف کے حق میں مہذب قسم کی خوشامد ہوتی ہے۔ یہ دیباچے یا "خوشامدچے" عموماً بڑے شاعروں اور ادیبوں کی خوشامد کر کے ہی لکھوائے جاتے ہیں۔ مشاعروں میں بے محل اور بے تکی داد بھی خوشامد کے زمرے میں آتی ہے۔

سماجی ادبی اور فلاحی تنظیمیں بھی خوشامد کے ذریعے فعال رہتی ہیں۔ وہ خوشامد ہی ہوتی ہے جس کے بل پر مہمانِ خصوصی (جو یا تو کوئی وزیر ہوتا ہے یا صاحبِ مال وزر) سے عطیات بٹورے جاتے ہیں اور دیگر مفادات حاصل کئے جاتے ہیں۔ سپاس نامہ دراصل خوشامد نامہ ہوتا ہے خوشامد اعلیٰ قسم کی اداکاری ہے لیکن کسی بھی اداکاری کی کامیابی اور مشہوری میں خوشامد اہم کردار ادا کرتی ہے۔

گداگروں کی آمدنی محض خوشامد کی وجہ سے دوگنی ہو جاتی ہے 'ہاں جو گداگر بڈھی کھوسٹ کو جوان اور حسین، بڈھے کو لڑکا، کمزور کو پہلوان، چپراسی کو صاحب، فقیر کو سیٹھ، کانسٹیبل کو تھانیدار اور مزدور کو فورمین نہ کہہ سکے اُسے خیرات میں بھلا کیا ملے گا؟؟؟ گداگری کیا سیل مین، بیمہ ایجنٹ، میڈیکل ریپ اگر خوشامد میں مہارت نہ رکھتے ہوں تو ناکام ہی رہیں گے۔

دنیا کی ہر زبان میں ہونے والی شاعری کا غالب حصہ محبوب کے مسکہ پالش پر مشتمل ہوتا ہے' محبوب کو رام کرنے کے لئے شعراء نے رگِ گل سے بلبل کے وہ پلر باندھے ہیں کہ ناطقہ سر بر گریباں ہے۔ شاعروں نے محبوب کی زلفوں کے سامنے کہیں گھنگھور گھٹاؤں کو مات دی ہے' کہیں ان کو سانپوں کے روپ میں پیش کر کے لوگوں کو ڈسوانا شروع کر دیا ہے' کہیں اس کے ماتھے پر ستارے سجا کر خدائی نظام میں مداخلت کی جسارت کی ہے' تو کہیں اس کی ابرو سے کشتوں کے پشتے لگوادئے ہیں پھر بھی جو بچ نکلے ہیں ان پر آنکھوں کی بجلیاں گرادی ہیں یا ان کو محبوب کی آنکھوں کے سمندر میں غرق کر دیا ہے۔ کہیں پلکوں کی کثافت کا وہ بیان ہے کہ چھانگا مانگا اور افریقہ کے جنگلات گم صم ہیں' کہیں ناک کی اونچائی کے سامنے ہمالیہ کو سرنگوں کر دیا ہے تو کہیں محبوب کی سانسوں سے

آب وہوا بدل دی ہے' کہیں رخساروں کی گرمی سے تھرمل پلانٹ چالو کردئے ہیں تو کہیں بادشاہ سے پوچھے بنا خونریز معرکوں سے فتح کئے ہوئے سمرقند و بخارا محض خالِ یار کے بدلے ہدیہ کرنے کا اعلان کردیا ہے۔ کسی ندیدے نے محبوب کے لبوں کو شہد اور امرت کی سبیل قرار دے دیا ہے اور کسی نے محبوب کے دانتوں کے سامنے ہیرے موتیوں کو ڈی ویلیو کردیا ہے۔ کہیں محبوب کے گردن دکھا کر صراحیوں کو چیلنج کردیا ہے اور کہیں سینے کو آتش فشاں چٹانوں کا درجہ دے دیا ہے۔ کمر کو یوں غائب کردیا ہے جیسے اپنے ملک میں کرپشن کے ثبوت، چال کے سمنے ہرن اور مور کو پانی بھرنے پر لگادیا ہے۔ قدو قامت کے لئے سرد کو اٹنشن کردیا ہے' گفتگو سے جھرنے جاری کردئے ہیں اور محبوب کا ایک جلوہ دکھا کر باغ میں آگ لگادی ہے۔

غیر شاعر عشاق بھی محبوبہ سے جتنی باتیں کرتے ہیں اس میں 5 فیصد سچ، 30 فیصد جھوٹ اور 65 فیصد خوشامد شامل ہوتی ہے۔ سخت سے سخت محبوبہ بھی خوشامد کے محلول میں فوراً حل ہو جاتی ہے' آزمائش شرط ہے۔ خوشامد صرف انسانوں میں ہی نہیں جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ سعدی، اقبال اور دیگر شعراء نے جانوروں کی خوشامدوں کے قصے نقل کئے ہیں۔ مثلاً وہ لومڑی جو کوے کے بے سرے گلے کو سُریلا کہہ کر گانے کے بہانے پنیر لے اڑی، وہ لومڑی جس نے شیر کے ہاتھوں اپنے دشمن بھیڑیے کو شیر کی خوشامد کرکے مروادیا' وہ مکڑا جس نے خوشامد کرکے مکھی کو پھانس لیا اور وہ گدھا جو لومڑی کی خوشامد کے باعث اچھے گھاس کے پیچھے بیمار شیر کا نوالہ بن گیا۔

خوشامد میں محض ضمیر کو نیند کا انجکشن دینا پڑتا ہے۔ اور عزتِ نفس کو ٹھکانے لگانا پڑتا ہے پھر فائدے ہی فائدے، بقول حالی " جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے "اس بازار کا تو سارا کام خوشامد پر چلتا ہے۔

خوشامد کسی حد تک مبالغہ ہو سکتا ہے' اِس کی کوئی کنٹرول لائن نہیں ہے' جتنا آپ کا ظرف اجازت دے یا جس قدر ضرورت ہو۔ جیسے ایک صاحب، ایک غیر معروف شاعرہ سے کہہ رہے تھے "معاف کیجئے گا مجھے صرف تین شعراء ہی پسند ہیں غالب، اقبال اور معاف کیجئے گا محترمہ آپ کا نام میں بھول رہا ہوں" خوشامد کے بغیر اُردو لغت مکمل نہیں ہو سکتی کیونکہ بے شمار محاورے اور ضرب الامثال کا براہ راست تعلق خوشامد سے ہے۔ مثلاً جو گڑ سے مر جائے اسے زہر کیوں دیں۔ آپ کے منہ میں گھی شکر، جو ماں سے بڑھ کر پیار جتائے وہ دھوکے باز ہوتا ہے، تعریف جھوٹی بھی ہو تو اچھی لگتی ہے، دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے، سر آنکھوں پر بٹھانا، آنکھیں بچھانا، پھولا نہ سمانا، خراجِ تحسین پیش کرنا، زمین آسمان کے قلابے ملانا، رطب اللسان ہونا، رائی کا پہاڑ بنانا، سبز باغ دکھانا، دم ہلانا، شیشے میں اتارنا، باتوں میں آنا، دم بھرنا، شہد کی چھری، عش عش کرنا، بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہی بھلا، مکھن لگانا، مسکہ لگانا، جی حضوری کرنا، میٹھی چھری وغیرہ المختصر زندگی کے ہر شعبے میں خوشامد اس طرح داخل ہے کہ اِس کے بغیر زندگی گزارنا ممکن ہی نہیں اور کوئی جتنی بھی کوشش کرے اِس سے بچ نہیں سکتا' کہیں نہ کہیں وہ خوشامد کے دام میں ضرور آئے گا۔ کہیں اِس کی خوشامد کی جائے گی کہیں وہ کسی کی خوشامد کرے گا تو کام چلے گا لہٰذا "خوشامد زندہ باد" کیونکہ خوشامد کامیابی کی کنجی ہے جس سے ہر تالا کھل جاتا ہے۔

اُردو کے مشہور ادیب کنہیالال کپور خاصے طویل القامت تھے۔ ڈبلے پتلے ہونے کی وجہ سے ان کا قد کچھ اور بھی لمبا لگتا تھا۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے میں داخلہ لینے کے لئے آئے۔ انٹرویو بورڈ کے سربراہ پطرس بخاری تھے۔ اُنھوں نے ایک نظر کنہیالال کپور کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور پھر بیساختہ بولے "مسٹر کپور! آپ سچ مچ اتنے لمبے ہیں یا آج انٹرویو کے لئے خاص اہتمام کرکے آئے ہیں؟"

چُوڑی اور چلن

نادر خان سَر گروہ

"تم بڑے ہو کر کیا بنو گے ؟ کیا کرو گے ؟'' بچپن میں بڑوں نے یہ سوال پوچھ پوچھ کر ہمیں سنجیدگی سے اس جہت میں سوچنے پر مجبور کیا"۔ ابتدا میں بعض دلچسپ پیشوں نے ہمیں اپنی دل فریبیوں میں کافی اُلجھائے رکھا۔ لفٹ مین، اِسپائڈر مین، سُوپر مین، حلوائی .... فلمی وِلن وغیرہ۔ لیکن جب ہم کچھ اور بڑے ہوئے اور زیرِ ناک ہلکی ہلکی مونچھیں اُگنے لگیں تو ایک مستانی شام بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ چُوڑی والا بننا کیسا رہے گا.... ؟.... جو طرح طرح کے ہاتھوں میں رنگ رنگ کی چوڑیاں پہناتا ہے۔ کسی کے تصور میں بھی ہاتھ نہ آنے والے ہاتھوں کو تھامنے کے لیے اُسے کسی بہانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کوئی جتن نہیں کرنے پڑتے۔ وہ نرم ہاتھوں میں چوڑیاں پہنانے سے پہلے، اُنہیں خوب گوندھ گوندھ کر نرم سے نرم تر کرتا ہے، تاکہ اُس کی چوڑیاں نہ ٹوٹیں، جن کی فکر اُسے پرائے ہاتھوں سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ جس وقت وہ چوڑیاں پہنانے میں مگن رہتا ہے تب محلے کی بڑی بوڑھیاں اُس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھتی ہیں۔ پہلے پہل ہم یہ سمجھتے رہے کہ وہ اُس سے یہ فن سیکھنے کے اِرادے سے ایسا کرتی ہیں۔ لیکن ہمارے تجربہ کار دوست پُر جوش پوری نے بتلایا کہ .... وہ یہ مشاہدہ کرتی ہیں کہ شریف صورت مرد.... اپنے فن میں 'کس حد تک' ماہر ہے۔ اگر وہ نگوڑیاں اتنی دیر تک چوڑی پہنانے والے پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ چوڑی پہنانا بھی سیکھ لیتیں اور یہ کام اپنے ذمے لے لیتیں تو پرائے مرد کو اتنی دور سے آکر یہ زحمت نہ اُٹھانا پڑتی۔

پرائے مرد سے خیال آیا کہ اُن عورتوں کے شوہروں نے کیا چوڑیاں پہن رکھی ہوتی ہیں جو وہ "بہ ہاتِ خود" اُنہیں چوڑیاں نہیں پہنا سکتے۔ جب چوڑی پہنانا مردوں ہی کا کام ٹھہرا تو وہ یہ کام خود بھی تو کر سکتے ہیں۔ وہ شادی کے موقع پر صرف ایک انگوٹھی 'پہناتے' ہیں اور.... بس ؟۔

ایک زمانہ تھا جب عورتیں پرائے مرد سے ہاتھ ملانا تو دُور کی بات، اُس سے نظر ملانے کو بھی بُرا سمجھتی تھیں۔ اُن کی آواز کی لہریں اُن کے وجود کے گرد کھینچے گئے دائرے کو عبور کرنے سے پہلے ہی دَم توڑ دیتی تھیں۔ لیکن جب چوڑی پہننے کا شوق پورا کرنے کا موقع آتا تو کھلے عام، ہاتھ میں ہاتھ دے دیتی تھیں۔ اب بھی بعض غیُور خواتین چوڑیاں پہننے کی شدید خواہش تو رکھتی ہیں مگر لمسِ نامحرم سے کتراتی ہیں۔ سو.... وہ منہ پھیر کر، پلو کو دانتوں میں اڑس کر، اِس طرح ہاتھ چوڑی والے کے ہاتھ میں دیتی ہیں، گویا .... تن سے جدا کر دیا ہو۔

منہ پھیر کر اُدھر کو، اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

اس منظر کو دوسری خواتین، آنچل اور اپنی ہنسی کو دانتوں میں دبائے بڑی دلچسپی سے دیکھتی ہیں اور بے صبری سے اپنی باری کا انتظار کرتی ہیں۔ پھر جب.... سب کنواریاں، سب سہاگنیں اپنے اپنے ہاتھوں کو رنگ برنگی چوڑیوں سے سجا لیتی ہیں تو.... اُن کے وجود کے مدھم

نغمے.... چوڑیوں کی کھنک سے جاگ اُٹھتے ہیں۔ پھر طبیعت میں اُٹھی عجیب سی لہر، ایک نئی امنگ سے وہ سب دیر تک ایک آدا سے محظوظ ہوتی ہیں۔ چوڑی پہننے اور ایک دوسرے کو اپنا روپ دکھانے کے اِس عمل کے دوران چوڑی والا کسی نظر نہ آنے والی مخلوق کی طرح ان کے درمیان دیر تک گھرا رہتا ہے۔ بقول پُرجوش پُوری، عجب " نُورانی منظر " ہوتا ہے۔

یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن اِس کام میں ظاہری طلسمات کے ساتھ ساتھ مخفی خطرات بھی ہوتے ہیں۔ قسم قسم کی کلائیوں میں چوڑیاں پہناتے وقت نازک کلائی کے مڑنے اور اُس سے بھی نازک چوڑیوں کے ٹوٹنے کا اندیشہ۔ دوسرے یہ کہ ذرا ہاتھ او چھا پڑا تو نسوانی ہاتھ جم کر پڑنے کا خدشہ۔ بلکہ پورے جتھے کی طرف سے کُوٹے یا مانجھے جانے کا بھی کھٹکا لگا رہتا ہے۔ اندیشوں، وندیشوں، کھٹکوں و ٹکوں کے علاوہ یہ کہ کسی زنانی نے ہاتھوں میں چوڑیاں آڑس لینے کے بعد قیمت چکانے سے انکار کر دیا تو؟.... ہاتھ تو ہاتھ سے گیا ہی اور چوڑیاں بھی ہاتھ سے گئیں۔ پھر کوئی دوبارہ ویسے ہی ہاتھ پکڑ کر دکھائے جیسے پہلے پکڑا تھا۔

جہاں تک ہمارے اِس پیشے کو اختیار کرنے کی بات ہے تو اِس کی باریکیوں پر غور کرنے میں ہمارا اچھا خاصا ' جواں ' وقت ضائع ہو گیا اور وہ وقت بھی آیا کہ ہمارے ذہن سے اِس پیشے کے متعلق تمام خوش گمانیاں جاتی رہیں، جب ہم نے ایک چوڑی والے کو بُری طرح پٹتے دیکھا۔ ایک بزرگ خاتون سے اِس کی وجہ پوچھی تو وہ ہماری گمراہ کن ظاہری معصومیت کو دیکھ کر کہنے لگیں، " بچّے ہو۔ اِس طرح کے سوالات نہیں پوچھتے "۔۔۔۔۔ ہم سے رہا نہ گیا وجہ معلوم کرنے کے لیے بڑے ہونے تک انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ سو.... پُرجوش پوری سے پوچھا۔

" انھوں نے بتلایا " اُس بدنصیب نے چوڑی پہنانے میں "حد" سے زیادہ وقت لے لیا تھا۔ اور یہ تم کیوں اِتنا کُرید رہے رہو؟

وہ اِس لیے کہ ہم اِس پیشے کو اختیار کرنے کے متعلق سنجیدگی اور دلچسپی سے غور کر رہے ہیں۔

وہ بولے۔۔۔۔۔ تمہاری دلچسپی پر ہمیں کوئی شبہ نہیں، مگر یہ کام تمہارے بس کا نہیں۔ تم اِس کی جملہ شرائط پر پورے نہیں اُترتے۔ جثّے سے بالغ اور قابلِ اعتماد نہیں لگتے۔ شکل وصورت سے پورا آدمی نظر آنا چاہیے اور چہرہ مہرہ، وضع قطع، لباس شریفانہ ہو۔

"ہم نے کہا" بدل لیں گے حُلیہ۔۔۔۔۔ کام کا کام اور خدمتِ نصف خلق۔

نصف.... خدمتِ خلق!!! پُوری صاحب نے ہماری آنکھوں میں دُور تک دیکھتے ہوئے اِن لفظوں پر زور دیا۔ اِس کے بعد ہم نے اُن " کے سامنے کبھی اپنی اِس خواہش کا اظہار کرنے کی جرات نہیں کی۔

ایک روز ہم نے ایک چوڑی والے سے اِس فن کی باریکیاں جاننا چاہیں۔ جواباً اُس نے ہمیں اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ پھر کہا، " ایسی بھی جلدی کیا ہے؟

" ہم نے اُس کے جوابی سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا" کیا اپنی بیوی کے تم ہی چوڑیاں پہناتے ہو؟

"نہیں ! ہم نے انہیں سکھلا دیا ہے"۔

ہم نے جھٹ ایک اور سوال داغا، " پھر دوسری عورتوں کو بھی سکھا کیوں نہیں دیتے"۔

اُس نے کہا" برخوردار! تم اپنا ذہن صاف کرلو.... یہ ہماری روزی روٹی کا معاملہ ہے اور "خاندانی" پیشہ ہے۔ نازک کلائیاں اور کانچ کی چوڑیاں کمزور ہوسکتی ہیں، مگر صدیوں کے اعتماد کا رشتہ کہیں زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ ہم یہ نہیں دیکھتے کہ کس کا ہاتھ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ بلکہ دونوں خاندانوں کی ناک ہمارے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ چوڑی پہنانے والا اگر اس پیشے میں نیا ہو تو اکثر لوگ بدگمانی اور غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اُس کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں ہوتی مگر ناتجربہ کاری کے سبب ہاتھ کہیں کا کہیں پڑتا ہے۔ اسی لیے ہماری برادری کے نوعمر لڑکوں کو ابتدا میں چھوٹی بچیوں اور بڑی بوڑھیوں کو چوڑیاں پہنانے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ پھر جب عمر اور تجربے میں پختگی آتی ہے تب اُنہیں ہر عمر کی خواتین کو چوڑیاں پہنانے کا.... لائسنس مل جاتا ہے۔ یعنی وہ اُس مرحلے میں داخل ہو جاتے ہیں جب چوڑی پہنانے والے کا ہاتھ مشینی شکل اختیار کر لیتا ہے اور چوڑی پہننے والی .... جیسے پتھر کی مورت۔ بچو! میں نے دو نسلوں کے ہاتھوں میں چوڑیاں کھنکائی ہیں ۔ دلہنوں اور سہاگنوں کو سجتے دیکھا ہے۔ اپنے پر ناز کرتے، اپنی دنیا میں کھلکھلاتے، چہکارتے دیکھا ہے۔ لیکن مجھے تکلیف تب ہوتی ہے جب اُن کو ہاتھ پٹخ کر چوڑیوں کی کرچیاں بکھیرتے دیکھتا ہوں۔ کلائیاں سونی ہوتی دیکھتا ہوں۔ بیٹا ! تم کیا جانو! چوڑیوں کی کھنک، زندگی کا پتا دیتی ہے۔ خوشحالی کی دلیل ہوتی ہے۔ ماں، بہن، بیوی اور بیٹی .... ہر رشتے کا تقدس کانوں میں رس گھولتا ہے۔ کاش.... چوڑیوں کا چلن کبھی ختم نہ ہو"۔

بنگال میں بنگالیوں کی ہندی اردو کا جہاں تلفظ غلط ہوتا ہے وہیں جمع واحد اور تذکیر و تانیث کے اصول بھی بالکل الگ ہیں۔ مظفر حنفی کا جب کلکتہ یونیورسٹی میں تقرر ہوا تو کچھ عرصے بعد وائس چانسلر بھاسکر راؤ چودھری نے ان سے پوچھا: پروفیسر حنفی۔ آپ تو بنگلہ بول لیتے ہونگے۔ حنفی نے ہنس کر جواب دیا۔ جی سر! چائے کھابو اور جول کھابو کی حد تک۔
بنگلہ تو بہت آسانی سے سیکھی جاسکتی ہے۔ چودھری صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔
وہ تو ٹھیک ہے چودھری صاحب۔ حنفی صاحب نے کہا: لیکن میرے پاس وقت ہی کہاں ہے میں تو چوبیس گھنٹے اپنی اردو بچانے میں لگا رہتا ہوں۔

مخلوقی رشتے

کے ایم خالد

"مما" یا "ممی"

یہ مخلوق زیادہ تر 'برگر فیملی' میں پائی جاتی ہے۔ روپے پیسے کی بہتات کی وجہ سے ممی بچپن سے ہی 'پپلو' ہو جاتی ہے، جسے بعد میں 'انسانی وضع' میں لانے کے لیے ان تھک محنت کی جاتی ہے اور عجیب و غریب طریقے اختیار کیے جاتے ہیں، جس کے باعث وہ پچاسی کلو سے پچیس کلو میں واپس آجاتی ہے۔ چوں کہ اس مخلوق کا ساری زندگی ڈائٹ، فیشن اور میک اپ کے ساتھ گہرا تعلق رہتا ہے، اس لیے مضر اثرات جوانی سے قبل ہی بسیرا کر لیتے ہیں۔ ڈھلتی عمر کے ساتھ اس کی مثال 'بوڑھی گھوڑی لال لگام' جیسی ہو جاتی ہے۔ بھنویں بار بار ترشوا کر غائب ہو جاتی ہیں، سر کے بال بار بار رنگنے اور سٹیٹنر سے سیدھے کرانے کی وجہ سے بالآخر کار ایک دن ہاتھ میں آجاتے ہیں۔ وِگ کو سر پر سیٹ کرنے کے لیے ممی پہلوانوں کی طرح ہفتے میں ایک مرتبہ اپنے سر پر اُسترا ابھی پھروا لیتی ہے۔ پھر ایک دن ایسا بھی آتا ہے کہ ممی کو دیکھ کر بے اختیار اہرامِ مصر کی 'ممی' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

کسی ممی نے منے کو بار بار منع کیا، بیٹا جانی! آپ آیا کے ساتھ سو جاؤ، میں میٹنگز سے تھکی ہاری لوٹی ہوں۔ مگر منا نہ مانا۔ رات سوئے ہوئے منے کی آنکھ ممی کے خراٹوں سے کھل گئی۔ زیرو لائٹ بلب کی نیلگوں روشنی ماحول کو خوف ناک بنا رہی تھی۔ معصوم ذہن، منے کی نظر ممی پر پڑی تو اس کی چیخوں سے کمرہ گونج اٹھا۔ ممی کی وِگ اور دانت، سائڈ ٹیبل پر خوف ناک انداز میں پڑے تھے۔ منے کی چیخوں سے ممی کی آنکھ کھل گئی۔ اس سے قبل شاید نیند کی گولیوں کی وجہ سے کبھی نہ کھلی تھی۔ سامنے ڈرائنگ ٹیبل کے شیشے میں اپنا ہیولہ دیکھ کر ممی نے منے کی چیخوں میں اپنی چیخیں شامل کر دیں۔

"امی"

یہ مخلوق سفید پوش طبقے میں پائی جاتی ہے۔ نو جماعت تک پڑھی ہوتی ہے، اس کے باوجود محلے میں اپنی مشہوری ایف اے پاس کے طور پر کرواتی ہے۔ عموماً محلے کے پانچویں تک کے بچے، اس کے پاس ٹیوشن پڑھتے ہیں۔ اس کے چہرے پر بناؤ سنگھار بھی مصنوعی سا محسوس ہوتا ہے۔ کہیں شادی یا فوتگی پر جانا ہو تو بہت کوشش کر کے کرایہ پورا کرتی ہے۔ مہندی کے دن، لاکھ چھپانے کے باوجود، دوپٹے کا 'ٹنک' اس کا بھید کھول دیتا ہے۔ کپڑوں سے اٹھتی فینائل کی گولیوں کی خوشبو ان کے پرانے ہونے کا پتا دیتی ہے، جسے سستے قسم کے پرفیوم کی خوشبو سے روکنے کی کوشش میں عجیب سی مہک ہر سو پھیل جاتی ہے۔ الرجی سے چھینکتے لوگ اس کو دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ واپسی پر بھی کسی سے کرایہ مانگ کر ہی واپس آتی ہے۔ گھر کے بجٹ کو قابو کرنے کی کوشش میں خود بے قابو ہو جاتی ہے۔ سمجھدار ہوتی ہے، بچوں کے کپڑے اور جوتے ان کے سائز سے بڑے خریدتی ہے، تاکہ کافی عرصہ چل سکیں۔ بچوں کے جلدی قد نکالنے پر فکر مند ہو جاتی ہے۔ گھر کے سارے کام خود ہی کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ کفایت شعار ہوتی ہے، آدھا کلو گوشت سے بتیس بوٹیاں بنا لیتی ہے۔ محلے میں عموماً کمیٹی
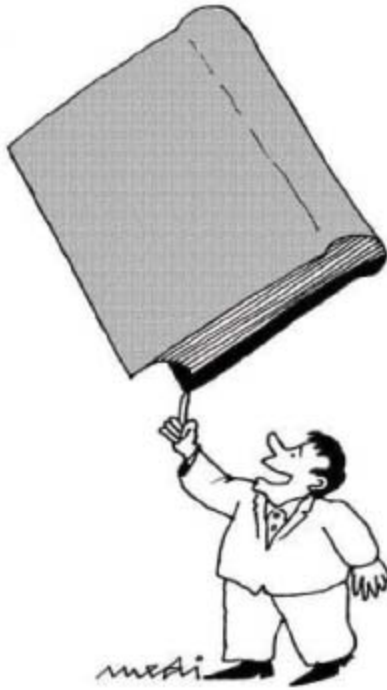
والی مائی' کے نام سے مشہور ہوتی ہے۔ بچے باہر سے کسی سے مار کھا کر واپس آئیں تو بھی حفظِ ماتقدم کے طور پر امی اپنے ہاتھوں سے اُن کی دوبارہ دُھنائی کرتی ہے۔اِس کے بچوں سے عموماً گدو یا کسی سستی قسم کی سبزی کی خوشبو اٹھتی ہے۔

جاسوسی ناول نگار

"بے بے"

بے ڈول قسم کی یہ مخلوق زیادہ تر غریب طبقے میں پائی جاتی ہے۔ بے بے چوں کہ بچپن سے ہی 'بے بے' ہوتی ہے۔ بے بے کی بے بے اس کو پانچویں پر اٹھے کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھ کر کہتی ہے، ''یہ میرا منڈا نکلے گی''اور بے بے واقعی منڈا نکل آتی ہے۔ چوں کہ زیادہ کھانے پینے کی طرف رجحان کی وجہ سے بے بے غبی ہوتی ہے، اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ پانچویں تک تعلیم حاصل کر سکتی ہے، جس میں اِس کے فیل شدہ آٹھ سال شامل ہوتے ہیں، اس لیے تیسری جماعت تک اِس کی مسیں بھیگ جاتی ہیں، جو تین چار بچوں کی پیدائش کے بعد باقاعدہ مونچھوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ بے بے چوں کہ 'برائلر' کی طرح صرف کھانے پینے کا دھیان رکھتی ہے، اس لیے زیادہ بھاگ دوڑ سے گریز کرتی ہے۔ سہیلیوں کے ساتھ کھیلنے بھی چلی جائے تو اپنے جوتے اور کپڑوں کا خیال رکھتی ہے، کھیل میں حصہ نہیں لیتی۔اِس کے بچوں کی تعداد بارہ تو لازمی ہوتی ہے، بعض اوقات زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔اِس کے بچوں میں ایک بچہ تو لازمی "سائیں"ہوتا ہے۔اِس کے ایک دو بچے اِس کے ہاتھوں 'پھٹڑ' ہوتے ہیں، اُن کی یا تو پسلیاں ٹوٹی ہوں گی، یا وہ بازو یا ٹانگ سے کمزور ہوں گے۔ مارے بے کی ہو گی، وجہ 'پولیو' کی بیان کریں گے۔ بے بے کے ہاتھ چھٹ عادت کی وجہ سے عورتیں یا تو اِس کو دیکھ کر رستہ بدل لیتی ہیں، یا اِس کی ہاں میں ہاں ملاتی ہیں۔ اس مخلوق کے بچے بھی 'ر پھڑی' قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک کی چیخ کی آواز پر سبھی "ڈرون" طیارے اپنے ٹارگٹ پر اندھا دھند اٹیک کر دیتے ہیں۔ بوقتِ ضرورت بے بے قریبی ایئر بیس پر اُن کی ہنگامی امداد کے لئے تیار ہوتی ہے۔ بعض اوقات بے بے کا نام قریبی تھانے کے ریکارڈ میں 'بستہ ب' میں موجود ہوتا ہے۔ علاقے میں شادی بیاہ کے موقعوں پر بہت کم لوگ بے بے کو بلاتے ہیں۔ فوتیدگی بے بے اور اُس کے بچوں کے لیے بن بلایا پیغام ثابت ہوتی ہے، جس میں بے بے اور اُس کے بچے اپنی صلاحیتوں کا دل کھول کر مظاہرہ کرتے ہیں، جن میں میت کے ساتھ لیٹ کر رونا بھی شامل ہے۔ زیادہ بوڑھی ہو جانے پر بے بے اپنے گھر کے باہر ایک چھوٹی سی چار پائی ڈال کر اُس پر لیٹی رہتی ہے اور مونچھوں کو تاؤ دے کر، سر کو اوپر نیچے کر کے، ہر آنے جانے والے کو لڑنے کا اشارہ کرتی رہتی ہے۔

ثقیل الفاظ کا استعمال

ڈاکٹر عزیز فیصل

دوسروں کو متوجہ کرنے کے کئی حربے یار لوگوں نے دریافت کر رکھے ہیں۔ یہ ذوق صرف مرد حضرات تک محدود نہیں رہا۔ خواتین بھی اس شعبے میں مردوں کے شانہ بہ شانہ کھڑی نظر آتی ہیں۔ مردوزن کا یہ "شعبدہ باز" طبقہ گفتار و کردار کے لحاظ سے جگہ جگہ "جلی حروف" کی طرح نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ لباس، چال ڈھال، فیشن، رہن سہن، پسند و ناپسند، حرکات و سکنات وغیرہ کو اوٹ پٹانگ رخ دیا جائے تو ہر عمر کے افراد اس مضحکہ خیز "ڈھونگ" کو ٹکٹکی باندھ کے ایسے دیکھنے لگتے ہیں کہ جیسے بچے "مسٹر بین" کا کوئی شو دیکھتے ہیں۔ متوجہ کرنے کا یہ عمل اور زیادہ سنگین صورت اختیار کر جاتا ہے کہ جب کوئی مرعوب کرنے کا بھی بیڑا اٹھا لے۔ ویسے تو ون ویکنگ، فرنچ کٹ داڑھی، گھنی اور عمودی مونچھیں، نیم عریاں ملبوسات، رومانسی قہقہے، قیمتی گاڑی، جدید موبائیل وغیرہ دوسروں کو مرعوب کرنے کے سکہ بند ذرائع کہلائے جا سکتے ہیں، تاہم گفتگو میں ثقیل الفاظ کا شعوری استعمال بھی ایک ایسی ٹیکنیک ہے جسے بروئے کار لا کر دوسرے افراد کو مرعوب کیا جا سکتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ ٹیکنیک عموماً دو قسم کے افراد بے رحمانہ انداز میں استعمال کرتے ہیں۔

پہلی قسم ان اہل زبان کی ہے جن کو ان ثقیل الفاظ کے املا اور مفہوم کا کماحقہ اندازہ ہوتا ہے۔ جب ایسے افراد روزمرہ گفتگو میں بھی موٹے موٹے اردو الفاظ بولنے پر اتر آئیں تو ان کے مخاطبین کے چہروں پر حیرانی کے کئی رنگ بکھر جاتے ہیں اور وہ بقول شاعر۔۔۔۔۔ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔۔۔۔ کے مصداق اپنا سا منہ لے کے رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ ایسے افراد سے متفق ہوئے بغیر رہا نہیں جا سکتا، چاہے اس اتفاق کے "منقولہ و غیر منقولہ" نقصانات کچھ بھی ہوں۔ کئی تجربہ کار اساتذہ کرام کی تدریس اسی زمرے میں شمار کی جا سکتی ہے۔ اس گفتگو کا ایک گونہ اطمینان بخش پہلو یہ ہے کہ کم از کم دو افراد میں سے ایک کو تو اصل بات کا علم ہوتا ہے۔ لیکن یہاں دوسری قسم کے ان افراد کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہو گا جو ثقیل الفاظ کا بے تحاشا استعمال کرتے چلے جاتے ہیں لیکن انھیں خود بھی علم نہیں ہوتا کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے؟ ان کے مخاطب بھی باکمال لوگ ہوتے ہیں جو مذکورہ بالا "عالمانہ بصیرت" سے بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ یہاں معاملہ بہت ہی مزاحیہ صورت حال میں رنگا ہوا ہوتا ہے کیونکہ گفتگو کے اصل مقصد کا علم نہ تو مقرر کو ہوتا ہے اور نہ ہی مخاطب کو لیکن دونوں افراد پوز ایسے کرتے ہیں کہ جیسے وہ اس لایعنی گفتگو کو حرف بہ حرف سمجھ رہے ہیں۔ بجٹ تقریر کے تمام نکات پر حزب اقتدار کا اتفاق اور حزب اختلاف کا عدم اتفاق ایسی ہی گفتگو کے نمونے کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

ایک ایسے ہی صاحب کا قصہ سن لیں کہ جس کو کو موٹے موٹے اردو الفاظ استعمال کرنے کا خبط تھا۔ وہ ریل گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ دوران سفر ان کی طبیعت ناساز ہونے لگی تو ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے شخص سے مخاطب ہو کر کہنے لگے، قبلہ! کیا اپ کی توجہ مستعار لے سکتا ہوں؟

اس سادہ مزاج شخص نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلا دیا۔ یہ صاحب اس سادہ دل شخص سے یوں مخاطب ہوئے "ہماری طبیعت ساعت بہ ساعت گھمبیر ہوتی جا رہی ہے، معدہ متورم اور قلب میں اختلاج ہے، مستزاد یہ کہ بلند فشار خون، سوزش جگر سوختہ اور استخوان میں درد کی شکایت ہو رہی ہے۔ آپ ریلوے گارڈ کو مطلع کر دیں"۔

وہ صاحب سر پکڑ کر اس کی گفتگو سنتے رہے اور ظاہری خراب صورت حال کو بھانپ کر یہ کہتے ہوئے ریلوے گارڈ کی طرف دوڑ پڑے "میں ریلوے گارڈ سے کہہ دیتا ہوں کہ آپ فوت ہو چکے ہیں"۔

"چولیات"

بڑھا چڑھا کے چول کو بنا دیا بقراط
عظیم کام یہ ننھی سی جاں نے خوب کیا

یہ مجھ سے کہنے لگا تین من کا فربہ شخص
مبالغہ تو تنِ ناتواں نے خوب کیا

ڈاکٹر عزیز فیصل

نیم لفٹین کی حماقتیں

میجر راشد مفتی

1968 کا زمانہ تھا جب میں نے فوج میں کمیشن کے لئے فارم بھرا۔ یہ میری زندگی کا ایک اہم فیصلہ تھا جس کے تحت انٹرویو، میڈیکل، آئی ایس ایس بی کوہاٹ اور فائنل کال کے انتظار کی گھڑیاں گننی تھیں۔ فارم بھرنے کے بعد میری حالت خاصی حد تک بدل گئی تھی۔ میں نے خود کو نیم لیفٹین سیکنڈ لیفٹیننٹ سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ ابتدائی انٹرویو میں پاس ہونے کے بعد اور آئی ایس ایس بی کوہاٹ جانے سے پہلے میں چند تانگے والوں اور پیدل چلنے والوں سے لڑائی مول لے چکا تھا کیونکہ انہوں نے ایک "ہونے والے نیم لیفٹین" کو گھاس نہیں ڈالی تھی۔ ۔۔۔۔ آئی ایس ایس بی کے آخری انٹرویو میں بریگیڈیر صاحب نے صرف ایک سوال پوچھا اور انٹرویو میں پاس کر دیا۔ اور وہ سوال یہ تھا۔

Are you dating ?

ڈیٹنگ کا مطلب ہوتا ہے کسی لڑکی کیساتھ کورٹ شپ کی ملاقاتیں یعنی شادی سے پہلے لڑکی لڑکے میں راز و نیاز کی باتیں۔۔۔

اُس وقت مجھے ڈیٹنگ کا مطلب نہیں آتا تھا لہذا میں نے پھرتی سے جواب دیا۔۔۔ No sir...I am waiting

بریگیڈیر صاحب نے قہقہہ لگایا اور انٹرویو ختم کر دیا۔ میں پریشان ہوا لیکن انہوں نے مجھے آئی ایس ایس بی کے پورے امتحان میں پاس کر دیا۔ اس کے بعد میں لیفٹیننی کے نشے میں گھر واپس پہنچ گیا اور جی ایچ کیو سے آخری کال کا انتظار کرنے لگا۔

آخر ایک دن ڈاکیا دور سے ہی "لفٹین صاحب۔۔۔۔ لفٹین صاحب" پکارتا آیا، کال لیٹر دیا اور مبارکباد دی۔ میں نے اس کو 20 روپے انعام دیا۔ پھر میں مقررتاریخ پر ٹریننگ کے لئے پی ایم اے کاکول چلا گیا، وہاں جو وقت گزرا، وہ ایک الگ داستان ہے جو ساری زندگی یاد رہے گا۔

آخر پاس آؤٹ ہونے کے بعد میں اپنی یونٹ میں جانے کے لئے چھٹی پر گھر آگیا۔ مجھے ایک انجینیئر بٹالین میں پوسٹ کیا گیا تھا جو قراقرم ہائی وے شاہراہ اور ریشم پر کام کرتی تھی۔ مجھے حکم ملا تھا کہ رسالپور میں رپورٹ کرنی ہے کیونکہ ابھی یونٹ سالپور میں کھڑی ہو رہی تھی یعنی بن رہی تھی۔ میں نے اپنی آمد کی تاریخ یونٹ کو اس لئے لکھ دی کہ میرا شایانِ شان استقبال ہو گا۔

چھٹی گزارنے کے بعد میں رسالپور پہنچا تو استقبال کے لئے کوئی موجود نہ تھا۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ یونٹ ابھی کھڑی ہو رہی ہے اور میں پہلا آفیسر ہوں جو یونٹ میں پوسٹ ہوا ہوں۔ اگلے چند دنوں میں باقی آفیسرز بھی پوسٹ ہو گئے۔ مجھے یونٹ کا ٹریننگ آفیسر قائم کیا گیا۔

تجریدی شاعری کے قاری

میرے ذمے یونٹ کی ٹریننگ تھی۔ میں بہت خوش تھا یہ پہلی ذمہ داری تھی جو مجھے ملی۔ میں نے اوقات کے مطابق ٹریننگ اور گیمز کا بندوبست کیا اور کام شروع کر دیا۔ صبح صبح پی ٹی پریڈ اور شام کو گیمز۔

ایک دن گیمز کے دوران جوان ذرا سست نظر آئے، میں نے سب کو مرغا بنا دیا۔ بٹالین کا صوبیدار میجر بھی جو آنریری کپتان تھا، پریڈ میں موجود تھا۔ میں نے اس کو حکم دیا کہ مرغا بن جائے۔ اس نے نیم لفٹین سے ٹکر کی بجائے مرغا بن جانے کو ترجیح دی لیکن پریڈ کے بعد میری سی او کمانڈنگ آفیسر کے آگے پیشی ہوگئی کیونکہ کپتان صاحب (صوبے دار میجر) نے ہمارے شکایت کردی تھی۔ مجھے احساس تک نہ تھا کہ بٹالین میں صوبیدار میجر بہت بڑی چیز ہے اور مرغا بنایا کرتا ہے خود مرغا نہیں بنا کرتا۔۔۔۔ سی او صاحب نے میری ٹھیک ٹھاک گوشمالی کی۔ دفتر سے باہر آئے تو ایجوٹنٹ نے کہا کہ میرا جرم بہت بڑا ہے لہذا کورٹ مارشل ہوگا اور سزا کے طور پر نیم لفٹین سے صوبے دار میجر بنادیا جائے گا۔ پھر کہا کہ دوسرے دن مجھے صوبے دار میجری کے رینک کے نشان پہنائے جائیں گے۔ میں بہت پریشان ہوا اور اپنے بیٹمین (اردلی) کو بلا کر صوبیدار میجری کے نشانات لگادئے۔ دوسرے دن ایجوٹنٹ نے حکم دیا کہ سی او سے مل آؤ۔ میں سی او کے دفتر میں داخل ہوا اور سیلوٹ کیا۔ جب سی او صاحب کی نظر میرے کندھوں پر پڑی تو اچھل پڑے۔ پوچھنے پر ایجوٹنٹ کا حکم سنادیا۔ انہوں نے فوراً سیکنڈان کمانڈ کو بلایا اور باہر انتظار کرنے کا حکم دیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد سارا ڈرامہ میری سمجھ میں آگیا۔ نیم لفٹین واحد رینک ہے جس کو کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد میری اور صوبیدار میجر (آنریری کیپٹن) کی پکی دوستی ہوگئی۔ چند دن بعد میں نے انٹر کمپنی والی بال میچ کرائے، کچھ انعام وغیرہ بھی رکھے۔ ایک سپاہی بہت اچھا کھیلا۔ سب نے اس کی سفارش کی کہ اس کو پکا لانس نائیک بنادیا جائے۔ میں نے اسی وقت کینٹین سے رینک فیتی منگوا کر اس کو پکا لانس نائیک بنادیا۔

دوسرے دن سی او صاحب کے دفتر میں میری پیشی ہوگئی۔ جب میں دفتر گیا تو وہاں سیکنڈان کمانڈ، ایجوٹنٹ صوبیدار میجر، ہیڈ کلرک، موجود تھے۔ سی او صاحب نے مجھے ڈانٹ ڈپٹ کر کے چھوڑ دیا لیکن مسئلہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ میں نے مہاراجہ رنجیت کے دور حکومت جیسی ترقی ایک سپاہی کو دے دی تھی۔ اسے قانونی شکل کیسے دی جائے کیونکہ چار دن کی نوکری والے سپاہی کو پکا لانس نائیک نہیں بنایا جاسکتا تھا۔۔۔۔ سب نے کہا کہ اس کا رینک اتار لیتے ہیں لیکن سی او نہ مانا، اس نے کہا کہ ایک دفعہ رینک لگ گیا سو لگ گیا۔ سنٹر کمانڈنٹ کے پاس گئے۔ یہ مسئلہ اس کے بس سے بھی باہر تھا بہر حال، سارا کیس جی ایچ کیو کو بھیجا۔ پھر نہ جانے کہاں کہاں سے منظوری مل گئی۔ میرے خیال میں یہ واحد کیس تھا جو ایسے حل ہوا۔ اس میں بتانے والی یہ بات ہے کہ پرانے آفیسر جونئیر آفیسر کا خیال رکھتے ہیں اور ان کی حرکات کی پاسبانی کرتے ہیں، آج کل ایسے آفیسر ناپید ہو چکے ہیں۔

ایک شام سیکنڈ ان کمانڈ صاحب ہمیں کلب لے گئے۔ ہم باہر لان میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے ویٹر کے لئے آواز لگائی اور زور سے "کوہب" کہا۔ ایک ویٹر آگیا اور آرڈر لے کے چلا گیا۔ دوسرے دن ہم لوگ پھر کلب پہنچ گئے۔ میجر صاحب نے "کوہب" پکارا ویٹر آگیا اور چائے وغیرہ دے کے چلا گیا۔ اس کے بعد میں خود ایک دوسرے نیم لفٹیننٹ کے ساتھ اس کلب گیا اور "کوہب" کو آواز دی لیکن ایک دوسرا ویٹر آیا۔ میں نے اس کو آرڈر وغیرہ دے کے پوچھا کہ آج "کوہب" کدھر ہے۔ اس نے کہا کہ اس نام کا تو کوئی ویٹر نہیں۔ دوسرے دن ہم نے سیکنڈ ان کمانڈ سے "کوہب" کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ ویٹر کے لئے "کوئی ہے" کو کہتے ہیں جسے میں نے کوہب سمجھا تھا۔۔۔۔ میں دل ہی دل میں اپنی نادانی کو کوستا ہوا اپنے دفتر چلا گیا۔

چند دن بعد ہماری یونٹ کو حکم ملا کہ شاہراہ ریشم پر سڑک بنانے چلی جائے۔ مجھے سب سے بعد آنے کا حکم ملا تا کہ میں سب سے آخر میں بچے کھچے لوگ لے کے جاؤں۔۔۔۔۔ کچھ عرصہ بعد میں بھی شاہراہ ریشم پر پہنچ گیا۔ میرا ٹینٹ دوسرے افسروں کے ساتھ لگا دیا گیا۔ ایک بڑا ٹینٹ جس کو 180 پونڈ ٹینٹ کہتے ہیں۔ رہائش کے لئے اور دوسرا چھوٹا ٹینٹ جس کو 40 پونڈ ٹینٹ کہتے ہیں، غسل کے طور پہ لگا دیا گیا۔ چند گھنٹوں بعد میں نے محسوس کیا کہ سارے آفیسر غسل خانے والا ٹینٹ کچھ زیادہ ہی استعمال کر رہے ہیں اور ریڈیو، ٹرانسسٹر بھی ساتھ لے جاتے ہیں جس پر اونچی آواز میں موسیقی بھی سنی جاتی ہے۔ میں نے پوچھا تو تسلی بخش جواب نہ ملا۔

پھر دوسرے دن اس کا جواب اس طرح ملا کہ میں بھی ریڈیو کے ساتھ غسل خانے میں گیا۔ بات یہ تھی کہ مقامی پانی پینے کی وجہ سے پہلے چند دن پیٹ خراب رہتا تھا۔ اس پانی کی وجہ سے پیٹ میں بہت زیادہ گیس پیدا ہوتی تھی جس کی وجہ سے ریڈیو کا استعمال ضروری تھا کیونکہ سب کے ٹینٹ ساتھ ساتھ تھے۔ شاہراہ ریشم پر ابھی ہم نے ایک ماہ ہی گزارا تھا کہ مجھے بنیادی کورس کے لئے ایک سال کے لئے رسالپور بلا لیا گیا میں رسالپور چلا گیا۔ ابھی میری سروس کوئی تین ماہ ہوئی تھی۔ رسالپور کا زمانہ بھی پی ایم اے کی طرح یاد رہے گا کیونکہ میری ساری کلاس نیم لیفٹیننٹوں پر مشتمل تھی۔ کلاس کے بعد ہم لوگ خوب اودھم مچاتے اور شرارتیں کرتے تھے اور سینئرز سے ڈانٹ بھی کھاتے تھے۔ میرا کمرہ ساری شرارتوں کا مرکز تھا ویسے بھی میرا کمرا عجائب گھر سے کم نہ تھا۔ میں نے اپنے کمرے میں بہت سے اشتہار لگا رکھے تھے اور لوگ مجھے اشتہاری کہتے تھے۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

یہاں پر سگریٹ پینا منع نہیں ہے۔ ضرور پییں، ہمیں بھی پلائیں"

کتوں کو ساتھ لانا منع نہیں ہے، ضرور لائیں

کمرے میں تھوکنا منع نہیں، ضرور تھوکیں

اس طرح کے تقریباً اس کمرے میں اگر آپ کی کوئی چیز گم ہو جائے تو یہ نہ سمجھیں کہ ہم نے چوری کی ہے۔ ہم بعد میں استعمال کریں گے

ڈیڑھ درجن اشتہار لکھوا کر کمرے میں چاروں طرف لگائے گئے تھے۔ کمرے کے دروازے کے سامنے دیوار کے اوپر ایک گدھے کا سر لگایا ہوا تھا،اس کے نیچے ایک تختی پر لوبان اگربتی اور موم بتی وغیرہ رکھی ہوئی تھیں اس کا نام " حضورانور " تھا۔ جو بھی آفیسر کمرے میں آتا تھا،پہلے اس کو سلیوٹ کرتا پھر چند سکے عقیدت کے طور پر ضرور رکھتا تھا اور پھر واپسی پر سلیوٹ کیا جاتا تھا۔ ہفتے کے آخر میں سب چندے کے پیسے اکٹھے کرکے فلم دیکھا کرتے تھے۔

ان دنوں ہم نے ایک گدھا پال رکھا تھا۔ اس کو ہم نے بڑی مشکل سے رات بارہ بجے رینکنا سکھایا۔ ہمارے بیٹ مین کا کام تھا کہ رات عین بارہ بجے وہ گدھے کو ڈنڈا مارتا اور گدھا اپنی پوری آواز سے رینکنا شروع کردیتا تھا۔ اس کے بعد ہم اپنے کمرے سے ڈیک پر ایک ریکارڈ لگا لیتے جس کے بول تھے "سانوں نہر والے پل تے بلا کے" گدھے کی آواز اور ہمارے ڈیک کی آواز مل کے ایک عجیب سماں پیدا کرتی تھیں ۔لوگ آوازیں سن کے گھڑیاں بھی ٹھیک کرلیتے تھے۔

کورس کے دوران کلاس تک جانے کے لئے ہمارے پاس سائیکل تھی بلکہ کورس کے تمام آفیسر کے پاس سائیکلیں تھیں۔ کچھ عرصہ کے بعد ہم نے ایک کار خریدنے کا پروگرام بنایا۔ اس مہم میں چھ نیم لیفٹینوں نے حصہ لیا آخر کار ہم نے ایک کار ڈھونڈی یہ 1960 ماڈل کی فیٹ کار تھی۔ جس میں صرف تین بندے بیٹھ سکتے تھے۔ یہ ہمیں وہاں سے چار ہزار میں ملی تھی۔ ہم اس کو رسالپور لے آئے۔ اس پر ہم نے کمرے والے اشتہار پینٹر سے لکھوائے کار کے باہر بھی مختلف شکلیں بنوائی گئیں۔ کار کیا تھی، بس ایک عجوبہ تھی۔ اس کے استعمال کا طریقہ یہ تھا کہ جس آفیسر کو ضرورت ہوتی، وہ اس میں اپنا پٹرول ڈال کر چلاتا تھا۔ جہاں پر پٹرول ختم ہوا، اس کو وہاں چھوڑ دیا گیا۔ سب بیٹ مین دھکا لگا کر واپس لے آتے تھے۔ تقریباً دو ماہ کے بعد ہم نے اس کی اوور ہالنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لئے ہم نے محرم کی چھٹیوں میں پروگرام بنایا۔ 6عدد نیم لیفٹینوں اور بیٹ مینوں نے مل کر انجن کھول کر پرزے الگ کئے۔ ان کو مٹی کے تیل سے صاف کیا، پھر دوبارہ ان کو جوڑ دیا اور انجن فٹ کردیا لیکن ہماری حیرانگی کی انتہا نہ رہی جب انجن فٹ کرنے کے بعد ایک بالٹی بھر پرزے بچ گئے۔ یہ ہماری سمجھ سے باہر تھا کہ یہ سب پرزے کیسے بچ گئے۔ بہر حال ہم نے انجن کو اسٹارٹ کیا تو پتہ چلا کہ انجن سے ہر جگہ سے پانی اور تیل نکل رہا ہے۔ اس پر ہم نے اس کو بالٹی سمیت بیچنے کا ارادہ کیا اور بڑی مشکل سے 1500 روپے میں بیچ دیا۔

میں ادب کا استاد ہوں لیکن یاد رکھیں مسلح بھی ہوں

مشرقی پاکستان میں گڑبڑ کی وجہ سے ہمیں پہلے ہی فارغ کر دیا گیا اور میں واپس یونٹ میں آ گیا۔ آتے ہی میر ایبٹ مین چھٹی پر چلا گیا۔ اس کی جگہ ایک نیا بیٹ مین حفیظ نامی دیا گیا۔ یہ بڑا تیز طرار تھا جب ہم سڑک پر کام کے لئے جاتے تو یہ باقی نوجوانوں کے ساتھ سڑک پر کام کرتا تھا۔

ایک دن سڑک پر کام کرتے ہوئے اس کا پاؤں کمپریسر کے نیچے آ گیا۔ اس کو فوراً مقامی فوجی ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ چند دنوں بعد پتہ چلا اس کو ایف آئی یو والے پکڑ کر لے گئے ہیں۔ اس پر جاسوسی کا الزام تھا۔ پتہ چلا کی اس کا اصل نام بی ایل کیول ہے اور وہ ہندوستان کی فوج میں کپتان ہے۔ یہاں پاکستان میں جاسوسی کے لئے آیا ہوا تھا۔ خیر، میں نے بھی اس سے اپنے کپڑے اور جوتے پالش کروائے تھے۔
یہاں شاہراہِ ریشم پر کام کرتے ہوئے کچھ افسوسناک واقعات بھی ہوئے تھے۔ ایک دفعہ سڑک بنانے کے لئے پہاڑ پر بلاسٹنگ کی اور اس کے بعد جوان سڑک سے پتھر ہٹانے کے لئے لگ گئے۔ یکایک ایک بڑی چٹان ان کے اوپر گر گئی 14 جوان اس کے نیچے آ گئے۔ چٹان اتنی بڑی تھی کہ بلڈوزر سے ہٹائی نہیں جا سکتی تھی، اس کے لئے بارود سے بلاسٹنگ ضروری تھی لہذا ڈرل مشین سے سوراخ کر کے تھوڑی تھوڑی بلاسٹنگ کی گئی۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جوانوں کی لاشوں کا کیا حال ہوا ہو گا۔ کئی تابوتوں میں ہم نے وزن پورا کرنے کے لئے پتھر رکھ کے ان کے گھروں کو بھیجا۔

ہمارا ایک میڈیکل کیپٹن ابراہیم ہوتا تھا۔ وہ بنگالی تھا۔ وہ چھٹی سے واپسی کے وقت حادثے کا شکار ہو گیا۔ ان دنوں ہمارا ٹرانزٹ کیمپ ملاکنڈ میں ہوتا تھا۔ سب لوگ چھٹی کے بعد یہاں رپورٹ کرتے تھے، پھر یہاں کسی گاڑی کا بندوبست کر کے آگے بھیج دیا جاتا تھا۔ کیپٹن ابراہیم بھی جوانوں کے ساتھ چھٹی کاٹ کر آ رہا تھا کہ اس کی گاڑی حادثے کا شکار ہو گئی۔ اس حادثے میں چودہ جوان شہید ہوئے تھے۔ کیپٹن ابراہیم حادثے کے وقت باہر گر پڑا تھا اور پتھروں سے ٹکرا کر اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ ہم نے اس کی لاش کے ٹکڑے نیچے سے ایک جوان کی قمیض میں ڈال کر اوپر لائے تھے۔

اسی طرح ایک جوان ٹرک سے گرا تو کوئی نوک دار پتھر اس کے کان کے پاس اس طرح لگا کہ اس کے سر اور چہرے کی کھال بالکل اتر گئی۔ یہ بات ڈاکٹروں کی سمجھ سے باہر تھی کہ یہ سب کیسے ہوا۔۔۔۔ بہر حال، ایسے بے شمار واقعات شاہراہِ ریشم پر کام کرتے ہوئے گزرے تھے اس سڑک پر بے شمار جوانوں اور افسروں نے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ تقریباً ہر کلو میٹر پر ایک جوان آفیسر کی شہادت ہوئی تھی۔

1971ء کے اوائل میں ہمیں سیالکوٹ جانے کا حکم ملا کیونکہ مشرقی

پاکستان کی وجہ سے حالات بہت کشیدہ تھے۔ ہم لوگ یہاں سے سیالکوٹ پہنچ گئے۔ پھر سیالکوٹ سے بجوات کے علاقے میں بارودی سرنگیں بچھانے کا کام ملا۔ ہم نے علاقے میں بارودی سُرنگیں بچھانی شروع کردیں۔

ایک رات گہرے اندھیرے میں ہم سرحد پار کر گئے اس وقت ہمارے پاس کوئی گاڑی نہیں تھی، صرف ایک ایمبولینس تھی۔ ہم نے اسی میں بارودی سرنگیں ڈالیں اور آگے بڑھے، پھر اندھیرے کی وجہ سے ڈرئیور کو پتہ نہ چلا اور ہم سرحد پار گئے۔ آگے جاکر علاقہ کچھ اجنبی لگا تو شک ہوا۔ پھر کچھ سکھ اور گورکھے ملے تو شک یقین میں بدل گیا۔ بہرحال ہم کچھ گھبرائے نہیں۔ میں نے ڈرائیور کو کہا کہ گاڑی موڑے اور بھاگ چلے۔ گھبراہٹ میں ایمبولینس گاڑی بند ہوگئی۔ اتفاق سے یہ ایمبولینس دھکا سٹارٹ تھی، ڈرائیور نے نیچے اتر کر چند سکھوں کو آواز دی کہ مولوی صاحب ا! ذرا گاڑی کو دھکا تو لگادیں۔ اس پر پانچ دس مولوی آئے اور انہوں نے خوب دھکا لگا کر گاڑی سٹارٹ کردی۔ بعد میں ہم نے شور سنا کہ : یہ تو مسلوں (مسلمانوں) کی گاڑی تھی پکڑو "۔۔۔۔۔ لیکن ڈرائیور بڑی پھرتی سے گاڑی نکال لایا۔ جب ہم نے واپس ہیڈ کوارٹر رپورٹ کی تو جو سلوک ہمارے ساتھ ہوا وہ ایک الگ داستان ہے۔ ہم نے اس کے بعد پورے علاقے میں بارودی سرنگیں بچھادیں۔

لڑائی کے بعد کے امکان کی وجہ سے بارڈر کا علاقہ مقامی لوگوں سے خالی کروالیا گیا تھا۔ ایک رات میں سورہا تھا کہ ایک دھماکہ ہوا۔ میں سمجھا کہ لڑائی شروع ہوگئی ہے۔ صبح اٹھ کر دیکھا تو بارودی سرنگوں کے علاقے میں ایک بھینس اور ایک نیل گائے بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے پاؤں بارودی سرنگوں میں آگئے تھے۔ بہرحال، ان کو دیکھ کر جوانوں کے منہ میں پانی آیا۔ ہم رات کا انتظار کررہے تھے۔ پروگرام کے مطابق ہم نے ایک پارٹی حوالدار کریم کے زیرِ نگرانی ترتیب دی کہ وہ بغیر کسی رکاوٹ کے ان کو نکال سکیں۔

آدھی رات کے بعد وہ دونوں کو نکال لائے۔ جن مشکلوں سے انہوں نے اس کو نکالا، وہ ایک الگ داستان ہے۔ بہرحال ہم نے راتوں رات ان کو ذبح کیا اور ان کی کھالیں اور باقی چیزیں بڑی صفائی سے غائب کردیں اور باقی گوشت خوب مزے سے کھایا۔ صبح ہم نے ہیڈ کوارٹر کو خط لکھا کہ دونوں جانور رات کو مائن فیلڈ سے نکل گئے ہیں مگر چند دنوں بعد ہمیں ایک "پیار بھرا خط" ملا اوپر والوں کی طرف سے وارننگ تھی۔ اس میں یہ ساری روداد درج تھی۔

تم سب دور رہو۔۔۔۔۔ اب میں ڈاکٹریٹ میں نے کر رکھی ہے!

چند دنوں بعد 1971ء کی جنگ شروع ہوگئی اور میں نے اپنا کام ختم کرکے پیچھے مرالہ راوی لنک جو مرالہ ہیڈ کوارٹرز سے

نکلتی ہے،اس کے کنارے درختوں میں اپنا ہیڈ کوارٹر بنالیا۔

لڑائی کے دوران ایک صبح تقریباً گیارہ بجے میں جیپ میں بٹالین ہیڈ کوارٹر جا رہا تھا جو کہ مرالہ کے پاس تھا، ہم نے دیکھا کہ ایک ہندوستانی ہنٹر ہوائی جہاز ہمارے پیچھے نمودار ہوا۔ اس وقت ہم بالکل کھلے علاقے میں تھے جہاں کوئی آڑ نہیں تھی۔ جہاز نے ہماری جیپ پر غوطہ لگایا اور حملہ کرنے کی پوزیشن میں آگیا۔ ہم نے سوچا کہ ہمارا آخری وقت آگیا ہے۔ جہاز جب بالکل جیپ کے اوپر آگیا تو ہم نے دیکھا کہ پائلٹ ہماری طوف دیکھ کے ہاتھ ہلا رہا ہے اور مسکرا رہا ہے تو ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جان بچ گئی۔

لڑائی کے بعد دوبارہ ہم بجوات گئے کہ لگائی ہوئی بارودی سرنگیں صاف کر سکیں۔ ان دنوں دوسری طرف سکھوں اور گورکھوں کی ایک بٹالین کام کر رہی تھی وہ بھی اپنی بارودی سرنگیں صاف کر رہے تھے۔ ان سے ہماری دوستی ہو گئی تھی۔ وہ ہمیں پکوڑے کھلاتے اور مسلوں کے لطیفے سناتے تھے، کبھی کبھی وہ ہمیں نیل گائے مار کر بھیج دیتے تھے۔

ایک دفعہ کور کمانڈر صاحب ہماری کمپنی کے دورے پر آئے۔ میں نے ان کی اجازت سے چائے تیار کرنے کو کہا اور ساتھ ہی کمپنی کے صوبیدار کو مرغی کا گوشت روسٹ کرنے کا کہا۔

اس وقت کیمپ میں صرف ایک ہی مرغی تھی۔ صوبیدار ایک بڑی سی چھری لیکر اس کو پکڑنے دوڑا۔ مرغی کور کمانڈر کی ٹانگوں میں گھس گئی جیسے وہ پناہ مانگ رہی ہو۔ صوبیدار بھی بے اختیار مرغی کے پیچھے کمانڈر کی ٹانگوں میں جا گھسا۔ اس کے ہاتھ میں چھری تھی اور وہ خود با ریش تھا۔ کور کمانڈر صاحب نے مرغی کی جان بخشی کے احکامات جاری کر دئے اور سادہ چائے نوش فرمائی۔ کور کمانڈر اچھے موڈ میں تھے، انہوں نے اس کو انجوائے کیا اور جاتے جاتے اپنے وقت کی نیم لفٹینی کی حماقتیں سنا گئے۔

ان دنوں میری پلاٹون بمع نیم لیفٹنین کو حکم ملا کہ شکر گڑھ کے نزدیک راوی کے کنارے چلے جائیں اور وہاں مورچہ بند ہو جائیں۔ میں پلاٹون لے کر وہاں پہنچ کر مورچہ بند ہو گیا۔ میری پوزیشن راوی کے ادھر تھی اور دشمن راوی کے پار تھا۔ درمیانی فاصلہ تقریباً پندرہ سو میٹر تھا۔

ایک دن میرے پلاٹون حوالدار نے شکایت کی کہ راوی کے دوسرے کنارے ہندوستانی فوجی نہانے کے لئے آتے ہیں اور نازیبا حرکتیں کرتے ہیں اور یہ شغل کافی دنوں سے جاری ہے۔۔۔۔۔۔۔ میں نے دوسرے دن خود جا کر دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ دیکھنے پر تصدیق ہو گئی۔ میں نے ان کو وارننگ دے دی لیکن وہ باز نہ آئے۔ میں پلٹون حوالدار کے ساتھ مذاکرات کئے اور لائحہ عمل تیار کر لیا۔ دوسرے دن صبح صبح ہم نے مشین گن فٹ کی اور دشمن کا انتظار کرنے لگے۔ حسب معمول وہ نازیبا حرکات کے لئے نمودار ہوئے۔ میں نے انہیں وارننگ دینا ضروری

سمجھا اور میں نے اپنے منصوبے کے مطابق فائر کھول دیا۔ دس میں سے چار کو جہنم رسید کر دیا اور اس کی اطلاع میں نے اپنے ہیڈ کوارٹر کو دی۔ وہاں سے میرے گرفتاری کے احکامات آگئے اور انکوائری شروع ہو گئی۔ تین ماہ تک میں ایک عذاب میں مبتلا رہا، پھر مجھے ایک سخت وارننگ دے کر چھوڑ دیا گیا ایک نیم لیفٹین کے طور پر آخری حماقت تھی۔ اس کے چند دنوں بعد مجھے کپتان بنا دیا گیا۔ اس طرح ایک نیم لیفٹین کی حماقتیں ختم ہوئیں لیکن کپتانی کے پہلے دن ایک حماقت سرزد ہو گئی آپ بھی سن لیں

کپتان کا رینک لگانے کے بعد مجھے یونٹ کا ایجوٹنٹ بنا دیا گیا۔ پہلے دن دفتر میں داخل ہونے کے بعد میں نے گھر خط لکھا کہ ہم کپتان بنا دئے گئے ہیں۔۔۔۔ خط لکھ کر میں نے اپنے دفتر کے اردلی کو دیا اور کہا کہ ڈاک نکلنے کا وقت ہو گیا ہے، سائیکل لے جاؤ اور ڈاک خانے میں ڈال آؤ۔۔۔۔ ڈاک خانہ نزدیک ہی تھا، وہ خط لے کر چلا گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ سائیکل ہاتھ میں پکڑے واپس آ رہا ہے۔ میں سمجھا شاید سائیکل خراب ہو گیا ہے۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ سائیکل تو ٹھیک ہے وہ سائیکل چلانا نہیں جانتا تھا لہٰذا وہ میرے حکم کے مطابق سائیکل ہاتھ میں پکڑ کر لے گیا تھا۔

یہ تھیں اُس سنہری دور کی حماقتوں کی روداد۔۔۔۔۔ بقایا پھر کبھی سہی۔

سفر ہے شرط

باب اوّل

جیروم کے جیروم / نوید ظفر کیانی
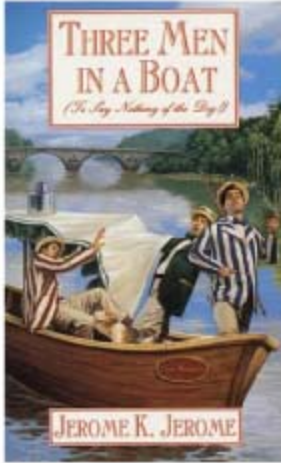
ہم چاروں وہاں موجود تھے۔۔۔ جارج' سیموئیل ہیرس اور میں اور مونٹمورینسی بھی۔۔۔اس دھاچوکڑی کا نشانہ میرا کمرہ تھا۔ کمرہ سگریٹ کے دھوئیں میں گم تھا اور ہم سب باتوں میں گم۔ پریشان اور پژمردہ ۔۔۔ ہماری باتوں کا ایک ہی موضوع تھا۔۔۔۔ ہم کتنے بُرے ہیں۔۔۔۔ میرا مطلب ہے طبّی نقطہ ءنظر سے ۔۔۔۔ آپ کچھ اور نہ سمجھ لیجئے گا۔

ہم سب بہت مضمحل تھے اور اپنی اس حالت کے بارے میں فکر مند بھی۔۔۔۔ ہیرس نے بتایا کہ بسا اوقات اس کے جسم میں ایسی کپکپی طاری ہو جاتی ہے کہ وہ کرتا کچھ ہے اور اُس سے ہو کچھ جاتا ہے۔ جارج نے بھی کچھ ایسی ہی کپکپی کا تذکرہ کیا اور یونہی کچھ کرنے کا اور کچھ ہو جانے کی شکایت کی۔۔۔۔۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو یہ کمبخت میرا جگر تھا جو خرابی پر آمادہ تھا۔۔۔ میں نے خود تشخیصی کے طور پر یہ جانا تھا کہ میرا جگر خراب ہے۔ دراصل میں نے ایک دواخانے کا مراسلہ پڑھا تھا جس میں اُن تمام علامتوں کی نشاندھی کی گئی تھی جو جگر کی خرابی کی غماز ہوتی ہے اور لگ بھگ مجھ میں یہ تمام علامتیں موجود تھیں۔

یہ غیر معمولی صورتحال سہی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میں نے کبھی بلا وجہ کسی دواساز کمپنی کا اشتہار نہیں پڑھا جب تک مجھے اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ مجھے اس قسم کا مرض لاحق ہے جس کے لئے یہ دوا اکسیر ہے۔ لیکن یہ بھی ایک امر دیگر ہے کہ میں نے جس اشتہار کو بھی ملاحظہ کیا ہے اُس میں بیان کردہ ہر بیماری کو علامت کو اپنے اندر موجود پایا ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک مرتبہ میں اُن معمولی امراض کے بارے میں مطالعہ کے لئے برٹش میوزیم گیا تھا جس کے بارے میں مجھے شبہ تھا کہ میں اُن میں مبتلاء ہوں مثلاً موسمی بخار وغیرہ۔۔۔ میں نے کتاب کھولی اور جو سامنے آتا گیا' پڑھتا گیا۔ اس دوران میں نے یونہی بے خیالی میں صفحہ پلٹا اور بلا سوچے سمجھے امراضِ معروضہ کے مطالعہ میں غرق ہو گیا اور یہ بھول ہی گیا کہ میں وہاں کس مقصد کے لئے آیا تھا' کچھ انتہائی دل دہلا دینے والے امراض پر نظر پڑی جن کی تباہ کاریوں سے میں واقف تھا۔ اُن کی پیش بینی کے لئے دی گئی علامتوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہی مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ یہ سب مجھ میں موجود ہیں۔

میں ایک لمحے کے لئے سُن ہو کر رہ گیا لیکن پھر کسی خوف کے زیرِ اثر میں نے اگلے اُس کتاب کی مزید ورق گردانی شروع کر دی۔ میں ٹائیفائڈ بخار پر پہنچا اور اُس کی علامتوں کا مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ میں تو ٹائیفائڈ بخار میں مبتلاء ہوں' اور وہ بھی کئی برسوں سے' بغیر اس کا ادراک کئے' یاالٰہی یہ مجھے ہو کیا گیا ہے اور کیا کیا ہو سکتا ہے؟ میں نے قترب یا رقصہ کے لئے صفحہ الٹایا' تو پایا پایا کیا پایا' جی ہاں۔۔۔۔ میں قترب میں بھی مبتلا تھا۔۔۔۔اب میں نے اپنے طبّی کیس پر مزید تحقیق کا ارادہ کیا اور حروفِ تہجی کے لحاظ سے امراض کا مطالعہ شروع کر دیا۔ سب

سے پہلے "جاڑے کے بخار" کی علامات پڑھیں' تمام تر علامات مجھ میں موجود تھیں اور یہ کہ بیماری کی نازک اسٹیج اگلے چند دنوں میں آیا ہی چاہتی ہے۔

"برائٹ" یا ضعفِ گردہ کے بارے میں پڑھا تو پتہ چلا کہ میں اس کی ارتقائی نوع کا شکار ہوں اور ایک دو برس تک جی سکتا ہوں۔ ہیضہ کی بیماری مجھے چند ایک پیچیدگیوں سمیت لاحق تھی اور خناق تو میری پیدائش سے میرے ہمراہ تھی۔ مسلسل چھبیس حروفِ تہجی کی بیماریاں مجھ میں موجود تھیں۔ محض نقصِ طبع (ورمِ ورجک) کی بیماری تھی جس نے مجھے بچہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔

اوّل اوّل تو اس امر نے مجھے پریشان ہی کر دیا کہ آخر یہ ورمِ ورجک کی بیماری نے میرے ساتھ رعایت کیوں کر رکھی ہے۔ میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔۔۔ کچھ دیر یہی ملامت کی کیفیت رہی لیکن اس کے بعد جب ذہن کچھ مزید سوچ بچار کے قابل ہوا تو میں خود کو خاص مراعات یافتہ تصور کرنے لگا۔۔۔ یعنی میرا دامن کی وسعت ہر قسم کی بیماریوں کو سمیٹنے کی اہلیت رکھتی ہے۔۔۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میرا احساسِ تفاخر اپنی انتہاء کو نہ پہنچ سکا۔ آخر مجھ میں ورمِ ورجک میں تو مبتلا نہیں تھا۔

تاہم "زاموسس" یا جراثیمی چھوت کی بیماری جو میری آگہی کو چیلنج کئے بغیر مجھ میں جانے کب سے در آئی تھی' کے بعد کوئی ایسی بیماری طبی دنیا میں نہیں بچی تھی جو مجھ میں ہو۔۔۔ اس کا مطلب ہے کہ میں ایسی بہت سے بیماریوں سے بچا ہوا تھا جو ابھی دریافت نہیں ہو پائی تھیں۔

اب میں سوچنے لگا کہ اگر میں طبیبوں کے ہاتھ لگ جاؤں تو کتنا دلچسپ کیس ثابت ہوں گا۔ میں ایک چلتا پھرتا ہسپتال ٹھہرا' طب کے طالبعلموں کو زیادہ تردد کرنے کی حاجت ہی نہیں رہی ہو گی' بس وہ میرا معائنہ کریں گے اور بیماریوں کے ایک عالم سے روشناس ہو جائیں گے۔ ڈگریاں وہیں کی وہیں انہیں تھمادی جائیں گی۔

اب یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ میری زندگی رہ کتنی گئی ہے میں نے اپنا جائزہ لینے کی ٹھانی۔ میں نے اپنی نبض پر ہاتھ دھرا اوّل اوّل تو مجھے اپنی نبض میں حرکت عنقا ملی پھر اچانک وہ مر بڑا کر چلنے لگی۔ میں نے اپنی گھڑی اتاری اور نبض کی رفتار نوٹ کرنے لگا۔ پتہ چلا کہ میری نبض ایک سو چالیس فی منٹ کے حساب سے دوڑ رہی تھی۔ اب میں دل کی دھڑکن کی طرف آیا، مجھے تو دل کی دھڑکن بھی سنائی نہ دی۔

ارے! دل نے تو دھڑکنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ مجھے تو یہ بتایا گیا تھا کہ دل کا کام دھڑکنا ہے اور میرا دل بھی اسی معمول پر گامزن ہے یہ اور بات ہے کہ مجھے اس کی دھڑکن سننے کا شعور نہیں۔ میں نے اپنے بالائی جسم کا سارا حصہ ٹٹول ڈالا کمر سے لے کر اس جگہ تک جہاں دل کی موجودگی کا گمان کیا جا سکتا تھا، یہاں تک کہ احتیاط کے طور پر کمر کو بھی تھپتھپا ڈالا لیکن نہ تو دل کا سراغ ملا اور نہ ہی اس دھڑکن کا۔ اب میں نے اپنی توجہ اپنی زبان پر مرکوز کی میں نے اسے ممکنہ حد تک باہر نکالا اور ایک آنکھ میچ کر اسے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے محض زبان کا کونا ہی نظر آسکا اور اس منظر سے میرے جس نظریئے کو تقویت ملی وہ یہ تھا کہ مجھے خسرہ بخار کا عارضہ لاحق ہے۔ کیسی ستم ظریفی تھی کہ میں جب دار المطالعہ میں آیا تھا تو ایک خوش باش صحتمند شخص تھا لیکن جب وہاں سے رخصت ہوا تو ایک خوف اور مایوسی کی تصویر تھا۔

میں نے اپنے معالج سے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا وہ میرا بہت پرانا واقف کار ہے اس کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ میری نبض پہ انگلی دھر دیتا ہے اور مجھے اپنی زبان دکھانے کا کہتا ہے۔ زبان دیکھتے ہوئے وہ موسم کے بارے میں گپ شپ کرتا رہتا ہے، یعنی یوں ہی لایعنیاں مارتا رہتا ہے باوجود یہ کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں بیمار ہوں، یہی وجہ ہے کہ اب مجھے موقع ملا تھا کہ میں اُس کے پاس جاؤں اور اگلے پچھلے تمام حساب چکتا کروں۔ بھلا ایک ڈاکٹر کو اور کیا چاہئے ہوتا ہے۔۔۔ میں نے سوچا۔۔۔ پریکٹس ہی ناں۔۔۔ تو مجھ میں کیا کمی ہے؟ وہ مجھ جیسے نادر الوجود مریض سے اتنے تجربات حاصل کر سکتا ہے جتنے سترہ ہزار مریضوں سے

بھی حاصل نہیں کئے جاسکتے' کیونکہ دوسرے مریض محض ایک مرض میں مبتلا ہوتے ہیں جبکہ میں۔۔۔۔۔
یہی سوچ کر میں نے اُس کے کلینک کی راہ لی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی حسبِ عادت بولا۔۔۔ کیوں میاں؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟؟
میں نے کہا۔۔۔ پیارے ڈاکٹر! میں آپ کو یہ بتانے میں وقت ضائع نہیں کروں گا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے' زندگی بہت مختصر ہے۔۔۔ اتنی کہ جب تک میں آپ کو اپنے امراض کے بارے میں بتاؤں گا' تو ممکن ہے کہ ہم میں سے کسی کی رخصتی کا نقارہ بج جائے۔۔۔ ہاں البتہ میں آپ کو یہ ضرور بتاؤں گا کہ مجھے کیا نہیں ہے۔۔۔ تو پیارے' مجھے صرف ورم ورچک نہیں ہے جس میں عموماً صرف خواتین مبتلا ہوتی ہیں۔ میں اگر آپ کو نہ بھی بتاتا تب بھی یہ حقیقت ہے کہ محض یہی ایک مرض ہے جس سے میں بال بال بچا ہوا ہوں۔ باقی تو جتنے بھی امراض ہیں وہ مجھ میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں"۔ اور میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے ان باتوں کا کیسے پتہ چلا؟
ڈاکٹر نے بغیر وقت ضائع کئے مجھے اسٹیچر پر لٹایا اور میری کلائی دبوچ لی۔ پھر اُس نے اچانک غیر متوقع طور پر میرے سینے پر میری چھاتی کو ٹھونکنا شروع کر دیا۔ انتہائی بزدلانہ حرکت تھی یہ۔۔۔ پھر اس کے بعد اس نے اپنے سر کے پہلو سے مجھے بجانا شروع کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہوا تو دوبارہ اپنی کرسی پر جا بیٹھا اور نسخہ تجویز کرنے لگا۔ نسخہ لکھ کر اس نے کاغذ کو تہ کیا اور مجھے تھما دیا۔ میں نے وہ نسخہ لے کر اپنی پتلون کی جیب میں ٹھونسا اور کلینک سے باہر نکل آیا۔
کسی انجانے خدشے کے تحت میں نے اُس نسخے کو پڑھنے کی زحمت ہی گوارہ نہیں کی بلکہ قریبی کیمسٹ کی دکان کا رخ کیا اور نسخہ اُسے تھما دیا۔ کیمسٹ نے ایک طائرانہ نظر اُس پر ڈالی اور مجھے واپس لوٹا دیا۔
اُس نے کہا کہ یہ چیزیں اُس کی دکان میں موجود نہیں۔۔۔!!
میں نے طنزاً کہا۔۔۔ کیا آپ کیمسٹ ہیں؟
وہ بولا۔۔۔ جی ہاں! لیکن میں محض کیمسٹ ہوں' اگر میری دکان دواؤں کے ساتھ ساتھ پرچون کا کام بھی کر رہی ہوتی' بلکہ ہوٹلنگ کا فریضہ بھی سرانجام دے رہی ہوتی تو شائد میں آپ کی خدمت کرنے کے قابل ہوتا۔۔۔ محض کیمسٹ ہونے کی وجہ سے میں اس سعادت سے محروم رہ گیا ہوں!!
اب میں نے نسخہ نکالا اور اُس پر ایک نظر ڈالی۔ اس میں درج تھا:
چھوٹا گوشت۔ ایک کلو بمع ایک پیگ بَرکے' ہر چھ گھنٹے کے بعد
ایک میل کی چہل قدمی۔ ہر صبح
نیند کا آغاز۔ ہر شب ٹھیک گیارہ بجے
نوٹ:۔ ایسے معاملات میں پنگا لینے سے حتی المقدور گریز جس کے بارے میں آپ کچھ بھی نہیں جانتے۔
میں نے اپنے معالج کی ان باتوں پر عمل کیا اور نتیجہ خاصا خوشگوار رہا۔۔۔ اور برسبیل تذکرہ' میری زندگی بھی محفوظ ہو گئی ہے اور ابھی تک جاری و ساری ہے۔
میں دوبارہ اُسی جگر کی دوا والے مراسلے کی طرف چلتا ہوں جس کے بارے میں میں نے عرض کی تھی کہ اِس میں جن علامتوں نے مجھے دہلا کر رکھ دیا تھا اس میں نمایاں علامت" ہر قسم کے کام سے کترانے کا عمومی رجحان"۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ مجھے اس ضمن میں کتنا کچھ بھگتنا پڑا تھا۔ جب میں بچہ تھا تو اس ظالم نے ایک لمحے کے لئے بھی مجھے نہیں بخشا تھا۔ اُس وقت میرے بڑوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ میرے جگر میں کچھ گڑبڑ ہے۔ تب سائنس نے بھی اتنی ترقی نہیں کی تھی جتنی اب ہے؛ چنانچہ اسے میرے ازلی ماٹھے پن سے تعبیر کیا گیا۔
تم بستر پر پڑے کیوں اینٹھتے رہتے ہو۔۔۔ وہ کہا کرتے تھے۔۔۔ کچھ کام وام کیوں نہیں کرتے؟
اب یہ اُن سادہ روحوں کی بلا جانے کہ مجھے کسی قسم کا کوئی مرض لاحق ہے۔

وہ مجھے گولیاں دیتے تھے بلکہ سمجھتے تھے کہ میں انہیں گولیاں دے رہا ہوں۔ چنانچہ میری گدی پر ایک کرارا سا ہاتھ جما دیتے تھے لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ یہ اور مزید حیران کر دینے والا ہوتا تھا کہ اُن کی حیرت کام دکھا جاتی تھی۔ میری بیماری فوراً فوچکر ہو جایا کرتی تھی۔ اس بات پر میرا ابھی ایمان ہوتا تھا کہ میرے بڑوں کی چپت نے میرے جگر کی بیماری پر نہایت مثبت اثرات چھوڑے ہیں اور میں اپنے آپ کو تیر کی طرح سیدھا محسوس کروں گا اور ہر وہ کام بغیر وقت ضائع کئے کر گزروں گا جس کا مجھے کہا جائے گا۔ آجکل ایسے علاج کی توقع تو گولیوں کے ایک پورے پیکٹ سے بھی کی جاسکتی ہے۔

بس ایسے ہی سادہ اور رجعت پسند ہوتے تھے وہ دن۔۔۔ لیکن اُن دنوں کے ٹوٹکے اتنے موثر ہوتے تھے کہ آج کل کے دواخانوں کے طویل معائنے اور علاج بھی اُن کی برابری نہیں کر پاتے۔

ہم تینوں آدھے گھنٹے تک وہاں بیٹھے رہے اور ایک دوسرے کو اپنی اپنی امکانی بیماریوں کے بارے میں بتاتے رہے۔ میں ولیم ہیرس کو اُس ہیجانی کیفیت کے بارے میں بتا رہا تھا جو مجھے صبح بیدار ہونے پر حاوی ہوتی تھی اور ہیرس ہمیں بتا رہا تھا کہ جب وہ بستر پر سونے جاتا ہے تو اُس کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ یہ بات اس نے نہ صرف زبانی کلامی بتائی بلکہ کمال کی اداکاری کرتے ہوئے ان تمام مارا ماری کی تصویر کشی بھی کی جس کا شکار وہ قبل از خوابیدگی ہوا کرتا تھا۔ جارج کا بھی یہی خیال تھا کہ وہ بیمار ہے لیکن یہ محض اُن کی خام خیالی تھی۔ یہ بات ہم سبھی جانتے تھے۔

عین اُسی وقت مسز پپٹ نے دروازے پر دستک دی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھیں کہ ہم رات کے کھانے کے لئے تیار ہیں یا نہیں؟ ہم نے ایک دوسرے کی طرف مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں فیصلہ کیا کہ بہتر ہے پہلے کچھ زہر مار کر لیا جائے۔ ہیرس نے نہایت دانشمندانہ انداز میں یہ قولِ زریں فرمایا تھا کہ پیٹ میں کچھ ہوتا ہے تو جراثیموں کے ہوش بھی ٹھکانے رہتے ہیں۔ مسز پپٹ کھانے کی ٹرے اٹھا لائی۔ ہم سب کھانے کی میز پر سنک گئے اور سب مل کر اسٹیک، روٹی اور سالن کے ساتھ کھیلنے لگے۔

اس وقت مجھ پر یقیناً خاصی نقاہت طاری ہو گی، کیونکہ کم از کم آدھ پون گھنٹے تک تو ایسا لگتا ہے کہ مجھے کھانے سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ کتنی عجیب بات ہے ناں! کہ مجھے پنیر تک کی طلب محسوس نہیں ہو رہی۔

کھانے کے بعد حسب معمول ہم تینوں نے اپنے اپنے جام از سرِ نو لبالب بھر لئے پائپ جلا لئے اور دوبارہ اپنی اپنی صحت کا رونا شروع کر دیا۔ ہم میں سے کسی کو بھی واضح طور پر علم نہیں تھا کہ ہماری صحت کو آخر ہو کیا گیا ہے، تاہم ہماری متفقہ رائے یہی تھی کہ یہ سب کام کی زیادتی کا کیا دھرا ہے۔

ہمیں صرف اور صرف آرام چاہیئے۔۔۔۔۔۔ ہیرس بولا

بالکل۔۔۔۔۔۔ آرام اور کچھ تھوڑی بہت تبدیلی۔۔۔۔۔۔ جارج نے کہا

کام کے دباؤ نے ہمارے اعصابی نظام میں ڈپریشن کا وائرس چھوڑ دیا ہے۔ اب ذہنی سکون اور توازن اسی صورت واپس لایا جاسکتا ہے جب معمولات سے ہٹ کر کچھ کیا جائے۔۔۔ زندگی کے منظر کو تبدیل کیا جائے۔

جارج کا ایک عم زاد ہے جو ہر چیز کو طبی اصطلاحات کی عینک سے دیکھنے کا عادی ہے۔ ہر چیز کو اسی نقطہء نظر سے دیکھنے کی بیماری جارج نے بھی اسی سے وراثت میں پائی ہے۔ میں اس کی اس بات سے متفق تھا اور خود بھی یہی چاہتا تھا کہ ہمیں اس ہتھیائے ہوئے ہجوم سے پرے کسی پرانے اور غیر ترقی یافتہ دنیا کو تلاش کرنا چاہئے اور وہاں کے خمار آلود سبزے پر خوابوں کے خیمے گاڑ لینے چاہئے ایسے گوشے میں جسے دنیا فراموش کر چکی ہو، جنہیں پریوں کے تلووں نے نہ چھوا ہو

اور جو اس شورش زدہ دنیا سے دور ہو کسی ایسے کنوارے ساحل پر جسے گذشتہ دو صدیوں کی لہریں چھو نہ سکی ہوں (کیا میں کچھ زیادہ ہی رومانوی نہیں ہو گیا ہوں)

ہیرس نے کہا کہ میں نے جس مقام کی تصویر کشی کی ہے وہ اسے جانتا ہے کہ جہاں لوگ سرِ شام سو جاتے ہیں، جہاں محبت کے لئے حوالہ جات یا روکڑوں کے پاپڑ نہیں بیلنا پڑتے اور جہاں گھروں کو پہنچنے کے لئے ٹراموں کے در پر سجدوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔

بحری سفر کے بارے میں کیا خیال ہے۔۔۔۔ جارج نے پوچھا۔

نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔۔ ہیرس بولا۔۔۔۔ اگر سکون اور تبدیلی کے متلاشی ہیں تو بحری پکنک اس کے لئے قطعی موزوں نہیں' مجھے بحری سفر پر شدید تحفظات ہیں۔۔۔ بحری سفر اس وقت تک بکار آمد نہیں ہو تا جب تک آپ نے اس کے لئے دو تین مہینے مختص نہ کر رکھے ہوں۔۔۔۔ ہفتے بھر کے لئے بحری سفر تو مزید تھکا دینے والا ثابت ہو گا۔

ذرا سوچیں کہ آپ بحری سفر کا آغاز پیر کے روز کرتے ہیں' یہ سوچ کر کہ آپ اس سفر سے حتی المقدور لطف نچوڑیں گے' ساحل پر کھڑے ہوئے ساتھیوں کو ہاتھ لہرا کر الوداع کہتے ہیں' اپنے سگار جلاتے ہیں اور عرشے پر یوں آن کھڑے ہوتے ہیں جیسے آپ کیپٹن "کوک" ہوں یا سر فرانسس ڈریک ہوں یا پھر کرسٹو کولمبس' بلکہ تھری ان ون ہوں۔۔۔ منگل کے دن آپ ناکوں ناک ہو کر کہتے ہیں کہ کاش میں نے اس سفر کا سوچ بھی نہ ہوتا۔۔۔ پھر بدھ' جمعرات اور جمعہ کے دنوں میں آپ سوچتے ہیں کہ کاش یہاں آنے سے قبل ہی آپ گزر گئے ہوتے' ہفتے کو آپ کچھ خوراک نگلنے کے قابل ہو پاتے ہیں' اس دن آپ عرشے تک آتے ہیں اور اُن رحمدل مسافروں کو مسکرا کر جواب دیتے ہیں جو آپ سے آپ کی خیریت پوچھتے ہیں' اتوار کو آپ دوبارہ روزِ اوّل کیطرح چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتے ہیں بلکہ وہ سب کچھ کھانے کے لائق ہو جاتے ہیں جو اس سفر سے قبل کھایا کرتے تھے اور پیر کی صبح جب آپ جہاز کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوتے ہیں' آپ کے ایک ہاتھ میں سفری بیگ اور دوسرے میں ایک چھتری ہے اور آپ کے قدم ساحل کی طرف اٹھ رہے ہوتے ہیں تو آپ کو بحری سفر سے کچھ کچھ اُنسیت محسوس ہو چکی ہوتی ہے لیکن اب کیا ہوت' کوئی بتلاوت۔

اِس موقع پر مجھے اپنا برادرِ نسبتی یاد آ رہا ہے جو ایک بار بحالی صحت کی خاطر بحری سفر پر روانہ ہوا تھا۔ اُس نے لندن سے لیورپول کے لئے برتھ کا دو طرفہ ٹکٹ بھی لے رکھا تھا اور جب وہ لیورپول پہنچا تو پہلا کام اُس نے یہ کیا کہ اپنے اُس ریٹرن ٹکٹ کو فروخت کرنے کی ٹھانی۔ اس سلسلے میں اُس نے کمال فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹکٹ پر سیل لگا دی تھی چنانچہ ایک نوجوان نے ہاتھوں ہاتھ وہ ٹکٹ خرید لیا کیونکہ کسی ڈاکٹر نے اُس کی صحت کی بحالی کے لئے ورزش اور بحری سفر تجویز کیا تھا۔

آخر بحری سفر ہی کیوں۔۔۔ میرا برادرِ نسبتی ٹکٹ کو اپنے ہاتھوں میں بھینچتا ہوا بولا۔۔۔ کیا تمہاری زندگی ایسی ہی فالتو ہے کہ تم اسے بحری سفر میں رولتے پھرو۔۔۔ اور ورزش' تم اس کے لئے خشکی پر رہتے ہوئے بھی کوئی کلب جوائن کر سکتے ہو۔

واپسی پر میرے سالے نے ریل گاڑی پکڑی۔۔۔ اُس کا کہنا تھا کہ نارتھ ویسٹ ریلوے تو اس کام کے لئے سب سے زیادہ صحت بخش ہے۔

میرا ایک اور دوست ایک ہفتے کے لئے بحری سفر کے لئے نکلا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنا سفر آغاز کرتا' جہاز کا منتظم رسد (سٹیورڈ) اُس کے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ کیا وہ دورانِ سفر اپنے کھانے کی ادائیگی ساتھ ساتھ کرتا رہے گا یا ہفتے بھر کی ادائیگی یکمشت کر دے گا؟ منتظم رسد دوسرے آپشن کے حق میں تھا کیونکہ یہ میرے دوست کے لئے بہت سستا پڑتا تھا۔ اُس نے اس حیرت انگیز رعایت کے بارے میں اُسے بتایا تھا کہ اُسے پورے ہفتے کے صرف ڈھائی پونڈ دینے ہوں

گے' زور کس پر ہوا "صرف" پر۔ کھانے کے لوازمات کے بارے میں اُس نے بتایا کہ کھانے پر بُھنی ہوئی مچھلی ملے گی' لنچ ٹھیک ایک بجے سرو کیا جائے گا' جس میں چار مختلف انواع کے کھانے شامل ہوں گے' شام کا کھانا چھ بجے ہوگا جس میں سُوپ' مچھلی' مرغی' سلاد' میٹھا' پنیر اور الحلوی (ڈیزٹ) پیش کیا جائے گا' جبکہ رات دس بجے بھی ہلکا پھلکا کھانا سرو کیا جائے گا۔

اِتنے بہت سے لوازمات کا سُن کر ہی میرے دوست کی رال ٹپکنے لگی چنانچہ اُس نے فوری طور پر منتظم رسد کی تجویز تسلیم کر لی۔

جہاز پر جس وقت لنچ کا وقت آیا تو اس وقت بمشکل جہاز کی روانگی کا عمل ہوا تھا' بھوک لگ بھگ عنقا تھی چنانچہ اُس نے ایک عدد گوشت کے اُبلے ہوئے ٹکڑے' سڑابری اور کچھ بالائی پر قناعت کی۔ دراصل گھر سے وہ قبل از وقت لنچ کر کے نکلا تھا اور یہ سوچ کر نکلا تھا کہ اُسے اونٹ کی طرح سارے ہفتے کا کھانا اپنے معدے میں بھرنا ہے اور اب معدے کا فیوز اُڑ چکا تھا۔

چھ بجے اُسے بتایا گیا کہ ڈنر تیار ہے۔ یہ اطلاع اُس کے لئے کوئی مژدہء جانفزا ثابت نہیں ہوئی' اُس کے اندر کسی قسم کی بھوک نہ جاگی لیکن اس آواز سے اُسے اس بات کا اطمینان ہوا کہ اب اُس کے ادا کئے گئے ڈھائی پونڈ کی خطیر رقم کا حق ادا ہو سکے گا۔ وہ

سیڑھیوں کی رسیوں کو پکڑتا ہوا نیچے اُترا۔ تڑکا لگی' بُھنی ہوئی مچھلی اور سلاد کی مسحور کن خوشبو نے آخری سیڑھی سے ہی اُس کو خوش آمدید کہا۔ سٹیورڈ خوشامدانہ مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی طرف بڑھا۔

آپ کی خدمت میں کیا پیش کیا جائے جناب۔۔۔۔۔ اُس نے دریافت کیا

مجھے یہاں سے فوراً واپس لے چلو۔۔۔۔ اُسے اپنی نقاہت بھری آواز سنائی دی۔

فوری طور پر کچھ ہٹے کٹے مددگار آگے بڑھے' اُسے سہارا دیا اور اُسے اُس کے کیبن تک چھوڑ آئے۔

اگلے چار دنوں تک اُس نے نہایت سادہ اور پرہیزگاروں جیسی زندگی گزاری اور دُبلے پتلے کیپٹن کے بسکٹوں (دُبلے پتلے بسکٹ تھے' کیپٹن نہیں۔۔۔ وہ تو بسکٹوں کا برانڈ نام تھا) اور سوڈا واٹر پر گزارہ کیا تاہم اتوار کو اس کی طبیعت خاصی بحال ہو گئی اور اس نے کیفے میں جا کر چائے اور خشک ڈبل روٹی پر بھی ہاتھ صاف کیا۔ پیر کے روز وہ اپنے رنگوں میں آ چکا تھا اور اُس نے خود کو بُھنے ہوئے مرغ کے روبرو لا کھڑا کیا۔ منگل کا دن اُس کی جہاز سے رخصتی کا دن تھا اور جب جہاز کنارے پر لنگر انداز ہو رہا تھا تو اسے یک گونا پشیمانی نے آن گھیرا تھا۔

یہ میں چلا۔۔۔ یہ میں چلا۔۔۔ اُس نے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔۔۔ دو پونڈ کے کھانے کو چھوڑ کر۔۔۔ وہ کھانا جو میرے لئے تھا لیکن میں کھا نہیں سکا تھا۔ کاش اُس کے پاس محض ایک دن اور ہوتا۔۔۔ یقیناً وہ اس دن اپنے تمام کے تمام ڈھائی پونڈ کے ساتھ نہ صرف انصاف کر سکتا تھا بلکہ بطور منافع کچھ اضافی خوراک بھی ڈکار سکتا تھا۔

یہ تو تھا میرے دوست کی روداد۔۔۔ اب میں دوبارہ اپنی طرف آتا ہوں' میں نے بحری سفر کا رخ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔۔۔ جی نہیں' یہ میں نے کوئی اپنی وجہ سے نہیں کیا تھا' آپ مجھ سے اس قسم کے حماقت آمیز فیصلے کی توقع نہ رکھیں۔۔۔ یہ جارج تھا جس کے استدلالی دھرنے نے ہم سب کو مجبور کر دیا تھا۔ اُس نے پُرزور انداز میں کہا تھا کہ اُس کی صحت صرف اور صرف بحری سفر کی مرہونِ منت ہے' بلکہ وہ تو بحری سفر سے بھرپور لطف اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے ہاں البتہ اُس نے ہیرس اور مجھے مشورہ دیا تھا کہ بحری سفر ہمارے بس کی بات نہیں ہے اس لئے ہمیں تو اس سے اجتناب ہی کرنا چاہئیے۔ ہم لوگ تو بحری سفر کے دوران یوں بیمار پڑ جاتے ہیں جیسے بجو بھادوں کی مات نہ لا کر بیمار ہو جاتا ہے۔ ہیرس نے کہا کہ اُسے بھی اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ لوگ بحری سفر کے دوران بیمار ہو کیسے جاتے ہیں۔ پھر اُس نے اس امر کا تجزیہ کرتے ہوئے قیاس کیا کہ یقیناً وہ لوگ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہوں گے۔۔۔ اُس

کہ کبھار خود کبھی کبھار سوچتا ہے کہ دورانِ سفر بیمار ہونے کا مزا چکھ لیا جائے لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ اس میں ایسے میں بیمار ہونے کی صلاحیت ہی مفقود ہے۔ اُس نے اس سلسلے میں ایک واقعہ بھی سُنایا کہ ایک مرتبہ بحری سفر کے دوران اُس کا جہاز طوفان میں پھنس گیا اور اس قدر ہچکولے کھائے کہ دوسرے مسافر اپنی اپنی برتھوں پر ہی انٹا غفیل ہوگئے لیکن سارے جہاز میں ایک وہ تھا اور ایک جہاز کا کپتان جس کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔۔۔۔ ہیرس اس ضمن میں جتنی کہانیاں سُنا چکا ہے اس میں اُس کے علاوہ ایک دوسرے شخص کا تذکرہ ہمیشہ ملتا ہے۔ اگر اتفاق سے دوسرا شخص نہ ہو تو کم از کم وہ خود ایسی مافوق الفطرت شخصیت کا مالک ضرور ہوتا ہے جو بحری سفر کے دوران بیمار نہ ہونے کا عظیم الشان کارنامہ تن تنہا سرانجام دیتا ہے۔

یہ بھی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ بحری بیماریوں کے سزاوار کہیں کسی قطعہ خشک میں نہیں پائے جاتے۔ بحری سفر میں آپ کو بھانت بھانت کی مخلوق ملے گی' بلکہ پورا کا پورا جہاز " seasick " ہوگا لیکن آپ کو خشکی پر کوئی ایسا شخص نہیں ملے گا جو یہ بتا سکے کہ آخر یہ "seasicking" ہے کیا بلا! آخر یہ ہزاروں لاکھوں لوگ جو آئے دن بحری سفر کرتے رہتے ہیں وہ خشکی پر نہیں جاتے تو کہاں چھپتے ہیں کہ اُنہیں اس بیماری کا پتہ ہی نہیں ہوتا۔

اگر زیادہ تو لوگ اُس شخص کی طرح ہیں جو ایک بار مجھے یارماؤتھ کی کشتی میں ملا تھا تو یقیناً اوپر بیان کردہ اسرار سے پردہ ہٹ جاتا ہے کہ آخر یہ لوگ جاتے کہاں ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ابھی ہم ساؤتھ پینڈ پیئر سے کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ میری نظر اُس شخص پر پڑی جو نہایت خطرناک حد تک سمندر کی طرف جھکا ہوا تھا۔ میں اُس کو بچانے کے لئے لپکا۔

ارے۔۔۔ پیچھے ہٹو۔۔۔ میں نے اُس کے کاندھے کو ہلاتے ہوئے کہا تھا۔۔۔ تم نیچے سمندر میں گر جاؤ گے!

کاش میں سمندر میں گر سکتا۔۔۔۔ اُس کی آواز میں حسرت تھی۔ میں نے بس اتنا سُنا تھا اور دوسرے ہی لمحے واپس پلٹ آیا تھا۔

اس واقعہ کے تین ہفتوں بعد میرا اسی شخص سے ایک کافی ہاؤس میں سامنا ہوا۔ وہ اس وقت اپنی مسافتوں کی رام کہانی سُنا رہا تھا کہ اُسے سمندر سے عشق ہے۔

محترم۔۔۔ میری یاد دہانی کرانے پر اُس نے ملائم انداز میں کہا تھا۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ ایک بار میرے ساتھ اسی قسم کا واقعہ ہوا تھا۔ ہمارا جہاز کیپ ہارن سے کچھ ہی فاصلے پر تھا کہ جہاز اُلٹ گیا تھا۔

کیا تمہیں یاد ہے کہ تم ساؤتھ پینڈ پیئر کے قریب بھی ایسے ہی اضطراب کا شکار رہے تھے اور سمندر میں کود جانا چاہتے تھے!

ساؤتھ پینڈ پیئر۔۔۔۔ وہ تذبذب کا شکار ہوگیا۔

جی ہاں۔۔۔ یارماؤتھ کی طرف جاتے ہوئے! غالباً وہ جمعہ کا دن تھا۔۔۔ تین ہفتے قبل!!

اوہ۔۔۔ اچھا۔۔۔ وہ۔۔۔ یک بیک اُسے یاد آگیا۔۔۔ ہاں مجھے یاد ہے۔۔۔ اُس وقت دوپہر تھی اور میرے سر میں شدید درد تھا۔۔۔ شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔۔۔ میرے ساتھ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔۔۔ آپ کیساتھ کبھی ایسا ہوا؟

جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں نے سمندر زدگی سے بچنے کے لئے ایک نہایت موثر طریقہ دریافت کر لیا تھا۔ سمندر زدگی کا مرض جہاز یا کشتی کے ہچکولوں کے باعث وقوع پذیر ہوتا ہے۔ آپ عرشے کے وسط میں کھڑے ہیں اور جہاز تیزی سے آگے پیچھے ہچکولے کھا رہا ہے تو آپ کو چاہیئے کہ آپ اپنے جسم کو سیدھا اور اکڑا کر رکھیں۔ جب جہاز کا اگلا حصہ اوپر اُٹھے تو آپ بھی اپنے جسم کو آگے کی طرف جھکا لیں' چاہے آپ کی ناک عرشے کے فرش کو چھو لے۔ اِسی طرح

جب جہاز کا بیرونی حصہ بلند ہو تو آپ بھی پیچھے کی طرف جھک جائیں۔ لیکن یہ مشق ایک دو گھنٹوں کے لئے تو ٹھیک ہے لیکن اگر معاملہ ہفتے کا ہو تو اللہ اللہ خیر صلا۔

جارج بولا۔۔۔اِس بار بحری سفر ہی سہی! کیوں یارو؟

اُس کا کہنا تھا کہ ہمیں اور کیا چاہیئے' تازہ ہوا' ورزش' سکون اور ہر روز ایک ہی منظر میں جیتے رہنے سے نجات۔۔۔اس باسی معمولات نے تو ذہنوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ بحری سفر کے دوران ہماری ورزش ہو گی' بھوک بھی لگے گی نیند بھی خوب آئے گی۔۔۔اور کیا چاہیئے ہمیں؟؟؟

ہیرس کا خیال تھا کہ جارج کو ایسا کچھ نہیں کرنا چاہیئے جس سے اُسے پہلے سے بھی زیادہ نیند آنے لگے کیونکہ یہ خود اُس کے لئے خطرناک ہو گا۔ وہ حیران تھا کہ آکر جارج کے پاس ایسی کون سی گیدڑ سنگھی ہے کہ وہ مزید سونے کا معجزہ دکھا سکتا ہے' جبکہ گرمی ہو یا سردی' ہر دن محض چوبیس گھنٹوں پر مشتمل ہوتا ہے تاہم اگر وہ مزید سونے میں کامیاب ہو گیا تو یہ تبھی ممکن ہو سکے گا جب اس زمان و مکان سے ماورا ہو کر سوئے اور اسے زندگی کی ضرورت نہ رہے' ویسے کیا اس سے وہ زندگی کے مصارف کے اخراجات بچانے میں کامیاب نہیں ہو پائے گا۔۔۔سوچنے کی بات ہے۔

ہیرس کا کہنا تھا کہ بحری جہاز اُسے بہت سُوٹ کرتا ہے کیونکہ بحری سفر سے نہ صرف اس کی توانائی بحال ہو جاتی ہے بلکہ جب وہ گھر لوٹتا ہے تو لگتا ہے کہ وہ کسی نئے گھر میں منتقل ہو گیا ہو اور وہ بھی بغیر کوئی پونڈ لگائے۔

میں بحری سفر کے حق میں تھا اور اس سلسلے میں میں اور ہیرس جارج سے متفق تھے اور سائد جارج کے خیالات ہم پہلی مرتبہ اس قدر متاثر ہوئے تھے۔

اصل میں جارج نے اس سے پہلے عقلمندی کی کوئی خاص بات کی ہی نہیں تھی۔

ہم میں سے ایک ہی فرد تھا جو اس تمام قضئے میں شدید تحفظات رکھتا تھا اور وہ تھا مونٹورینسی۔۔۔اُسے بحری سفر کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔

آپ لوگوں کے ساتھ تو بحری سفر میں سب کچھ اچھا ہی ہوتا ہے۔۔۔اُس نے یقیناً کہا ہو گا۔۔۔آپ لوگوں کو پسند ہو گا لیکن مجھے تو ہر گز ہر گز پسند نہیں۔۔۔نہ تو خوبصورت نظارے میرے لائن کی چیز ہیں اور نہ ہی مجھے جگہ جگہ سگار کی چمنی بننے میں مزا آتا ہے' ہاں کسی بلی کو میرے آگے چھوڑیں پھر دیکھئے گا میری پھرتیاں۔۔۔اور اگر میں سونے پر آجاؤں تو پھر کیا جہاز اور کیا لندن کی کوئی کٹیا۔۔۔مجھ سے اگر پوچھتے ہیں تو میں آپ لوگوں کے اس سارے تانے بانے کو ہی احمقانہ سمجھتا ہوں۔۔۔!

مونٹورینسی کے مقابلے میں ہم تین تھے چنانچہ بحری سفر کے حق میں تحریک کثرتِ رائے سے منظور کر لی گئی۔

(دوسرا باب انشاءاللہ "ارمغانِ ابتسام" کے اگلے شمارے میں)

ناصر کاظمی اور حبیب جالبؔ بے تکلف دوست تھے۔ جالبؔ نے ناصرؔ سے کہا۔۔۔۔۔"آپ کی غزلیات سن کر میری خواہش ہوتی ہے کہ کاش مجھ میں بھی ایسی غزل لکھنے کی استعداد ہوتی۔ جب میں آپ کا کوئی کلام دیکھتا ہوں تو میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کاش اس پر میرا نام لکھا ہو"۔

ناصرؔ نے جالب کی اس تعریف کا شکریہ ادا کیا۔ جالبؔ نے ناصرؔ سے پوچھا۔۔۔۔۔"میری غزل دیکھ کر آپ کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے"؟

ناصر نے جواب دیا: "خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ کی غزل یا نظم آپ کے نام سے ہی چھپی، غلطی سے میرا نام نہیں چھپ گیا"۔

خالد عرفان

عاشقوں کا مشغلہ ہر شام امریکہ میں ہے
جو نہ ہونا چاہئے وہ کام امریکہ میں ہے

برف پر چلنا مجھے لانا ہے جوئے شیر کا
تم تو کہتے تھے بڑا آرام امریکہ میں ہے

مولوی بھی میم پر نظریں جمائے ہے یہاں
جو برائے خدمتِ اسلام امریکہ میں ہے

میں نہ کہتا تھا کہ سردی سے یہاں پنگا نہ لے
چیختا کیوں ہے جواب سرسام امریکہ میں ہے

''فارٹی سیکنڈ'' کے اطراف میں مجھ پر کھلا
ہر کلر کا عاشقِ ناکام امریکہ میں ہے

خان صاحب کو مزا آنے لگا ہے ریل میں
پہلوئے گل خان میں گلفام امریکہ میں ہے

ایک گورا کہہ رہا تھا خالدِ عرفان سے
تُو تو پوئٹ ہے ترا کیا کام امریکہ میں ہے

خالد عرفان

ہو رہی ہے ملک میں ڈالر فشانی سود کی
ہر حکومت کوئٹہ تا راجدھانی سود کی

منعقد ہے بینک میں جو نعت خوانی سود کی
مولوی بھی کر رہا ہے پاسبانی سود کی

ایچ بی ایف سی میں شوہر، بیگم انشورنس میں
پورے کنبہ پر ہے قائم حکمرانی سود کی

میرے ماموں نے اثاثہ رکھ دیا ہے بینک میں
جوتیاں چٹخا رہی ہیں اب ممانی سود کی

لون کے پیسوں سے لائے تھے وہ دادا کا کفن
مل گئی مرحوم کو خلد آشیانی سود کی

دیکھ کے سونے کا جھومر اہلیہ نے یہ کہا
ہائے اللہ ! کتنی اچھی ہے نشانی سود کی

گیند بلے کی خریداری ہو یا کالج کی فیس
لون کا میرا لڑکپن، نوجوانی سود کی

گر شریعت پر عمل ہو جائے اپنے ملک میں
دیکھنا ! اک روز مر جائے گی نانی سود کی

ڈاکٹر عزیز فیصل

واہمے شام کی اخبار سے لگ جاتے ہیں
تندرست آدمی بیمار سے لگ جاتے ہیں

اس کی یادوں کی اگر گاڑیاں میں پارک کروں
دل کے گیراج میں انبار سے لگ جاتے ہیں

جن کو گھر والی نے لسی کے لیئے بھیجا تھا
وہ بھی میخانے کی دیوار سے لگ جاتے ہیں

رتجگے، خرچے، رقیبانہ جرح، فون پہ فون
یہ وہ آزار ہیں جو پیار سے لگ جاتے ہیں

ضبط تولید پہ آتا ہے اسی وقت یقیں
گھر میں جب لشکر جرار سے لگ جاتے ہیں

گھر سے باہر وہ نکلتی ہے فقط پیر کے دن
ہم بھی اک لائن میں اتوار سے لگ جاتے ہیں

منہ نہ صابن سے اگر دھو کے وہ باہر نکلے
داغ ان آنکھوں پہ دیدار سے لگ جاتے ہیں

بعض اوقات تری یاد کے چند آنے بھی
ڈالر و درہم و دینار سے لگ جاتے ہیں

سیٹھ ایسے بھی مرے شہر میں رہتے ہیں عزیز
مانگنے قرض جو نادار سے لگ جاتے ہیں

ڈاکٹر عزیز فیصل

سُروں سے سب کو کیسی دشمنی تھی
ترنم کی وبا پھیلی ہوئی تھی
درختوں سے پرندے اُڑنے لگتے
بشیراں اتنا اونچا کھانستی تھی
سر کوچہ سبھی کو رونا پڑتا
کہ وہ پیاز اتنے زیادہ کاٹتی تھی
تبرک کہہ کے عاشق چنتے جاتے
وہ کھڑکی سے جو چھلکے پھینکتی تھی
وہ پہنچا رات کے جب دو بجے گھر
تو بیوی جوتا تھامے سو رہی تھی
وہاں الحاج کیسے کوئی بنتا
بشیراں سب کا ڈیٹا جانتی تھی
جناب صدر نے جوتی اٹھا لی
غزل نقاد نے ایسی پڑھی تھی
میاں دھوئے گا برتن اور کپڑے
اسی ضد پر وہ برسوں سے اڑی تھی
سراہا سب نے اس کے تولیئے کو
جراثیموں کی جب میٹنگ ہوئی تھی
سجی ہے زن مریدوں سے یہ محفل
عزیز اس میں تمھاری ہی کمی تھی

نوید ظفر کیانی

آپ ہم یوں بین الاقوامے گئے
پُھولنا تھا جس میں وہ جامے گئے
جاہلوں کے حق میں کیوں نعرے لگے
علم کا جھنڈا تو ہم تھامے گئے
ارتقا نے چست خاصا کر دیا
تنگ ہے پتلون پاجامے گئے
کس قدر میک اپ کیا ہے ہائے ہائے
جن کو تھا یرقان گلفامے گئے
ہیر کو موٹی اسامی چاہئے
بن کے رانجھا جی یونہی کامے گئے
کس لئے درپے تھے اُن کی کھال کے
دیکھ لو ہاتھوں سے بے دامے گئے
تُو اسمبلی میں گیا ہر مرتبہ
یا ترے چاچے ترے مامے گئے
کل بھی ہم امریکی بُش میں تھے کہیں
آج بھی حالات اوبامے گئے
دیکھ کر قاصد کی نوسر بازیاں
اُن کے گھر ہم لے کے خود نامے گئے
گفتگو ہو گی ٹھکانے کی ظفرؔ
شکر ہے محفل سے علامے گئے

نوید ظفر کیانی

ملے ہیں اب ترے کتے بھی آ کے رستے میں
جو چھوڑ جاتے ہیں اکثر بھگا کے رستے میں
تمہارے کوچے سے باہر قدم نہیں اُٹھتے
یہ کس نے پھینکی ہے چیونگم چبا کے رستے میں
ہزارہا ہمیں پھینٹا تمہارے ویروں نے
"نہ ڈگمگائے کبھی ہم وفا کے رستے میں"
فقط وہی تو ہیں فنکارِ کلجگِ حاضر
جو چل پڑے کسی خوابِ سرا کے رستے میں
تری تلاش میں آ جاتا ہے ترا تاڑو
گدا نہیں ہے جو بیٹھے گا آ کے رستے میں
وہ عقد کرتے ہیں یا احتجاج کرتے ہیں
جو دھرنا دیتے ہیں تنبو لگا کے رستے میں
لگا کے آگ وہی میرے گھر میں آئے ہیں
جو مل رہے تھے بہت مسکرا کے رستے ہیں
لگا ہوا تھا جہاں منزلوں کا سنگ میل
میں آ گیا ہوں رہیں سے خلا کے رستے میں
فروخت کرتے ہیں کس انقلاب کا منجن
بٹھا رہے ہیں جو سب کو بلا کے رستے میں
وہ گولی دیتا ہے یا میڈیسن کی ڈوز ظفرؔ
یہ دیکھنے کو ہوں درد آشنا کے رستے میں

کومل مہک

وہ کچن آ کے مرا ہاتھ بٹانا اُس کا
گویا یوں اور مرا کام بڑھانا اُس کا

ٹوکتا ہے غلط اشعار پہ ظالم یوں مجھے
جیسے پھوپھا ہو کوئی یاس یگانہ اُس کا

قرض لے کر کوئی جائے تو بھلایا نہ جائے
ذکر کرتی ہے تبھی روز شبانہ اُس کا

کھائی ہے اُس سے اڑنگی تو مجھے یاد آیا
"یہ وطیرہ ہے محبت میں پرانا اُس کا"

تھے تو سرتاج بہت سوں کے مگر یوں ہائے
ماسٹر تاج کو "سرتاج" بنانا اُس کا

شکر ہے زور و زر و مال سے ممکن ہی نہیں
اپنے اعمال کسی طور بڑھانا اُس کا

اپنے لیڈر کا ہی حصہ ہے بوقتِ حاجت
اپنی دھوتی کو علم اپنا بنانا اُس کا

کومل مہک

دُم ہلانے کی اجازت نہیں دی جائے گی
یُوں پٹانے کی اجازت نہیں دی جائے گی

حُسن پر حُسنِ نظر کیجئے لیکن صاحب
بیویانے کی اجازت نہیں دی جائے گی

عقد کر سکتے ہو تم تین مگر یاد رہے
درمیانے کی اجازت نہیں دی جائے گی

اُن کی محفل میں سلیقے سے کوئی بات کرو
ہنہنانے کی اجازت نہیں دی جائے گی

یُوں بھرم کھل کے نہ رہ جائے ترے پیاروں کا
آزمانے کی اجازت نہیں دی جائے گی

عرفان حیاتؔ

مل رہے ہیں پونڈ و درہم کیا کریں
لکھ رہے ہیں ہم بھی کالم کیا کریں

کردیا حالات نے لٹو انہیں
وہ جو بنتے تھے منجّم کیا کریں

آپ کی لاتوں سے ہیں بے حال ہم
آپ کی باتوں کے سرگم کیا کریں

جینا مرنا ہے غریبستان میں
تیرے پورب تیرے پچھّم کیا کریں

وہ نہ مانیں تو گنوائیں بات کیا ؟
کام نہ آئے تو وزڈم کیا کریں؟؟؟

پوچھ کر دنیا میں تو آئے نہ تھے
سو ترے جانے کا ماتم کیا کریں

بس نہیں چلتا اگر تقدیر پر
''جانے والی چیز کا غم کیا کریں''

عرفان حیاتؔ

"یہ وطیرہ ہے محبت میں پرانا اُس کا "
کارڈ خوباں سے سدا لوڈ کرانا اُس کا

اُس کی فرمائشِ بیجا سے میں کنگال ہوا
اور کنگال بھی ہونے کا ہے طعنہ اُس کا

حُسنِ بیباک کسی ایک کا رہ سکتا نہیں
جان کتنے ہی دلوں میں ہے ٹھکانہ اُس کا

رعب میں آؤں یا ظالم پہ میں مرمٹ جاؤں
شیر خاں نام پر انداز زنانہ اُس کا

اُس کی مرضی کا ہو "دی اینڈ" یہ انصاف نہیں
میرے کردار سے چلتا ہے فسانہ اُس کا

میری قسمت میں فقط چچوں کی ملیاں کیوں ہے
نیو یارک اُس کا ٹمبکٹو اُس کا ویانا اُس کا

سید فہیم الدین

غالب ہیں وہ گویا بدل کھینچ تان کر
کہنے لگے ہیں کل سے غزل کھینچ تان کر

زوجہ کو پہلے روز ہی آنکھیں دکھائیں گے
یہ فیصلہ ہے اپنا اٹل کھینچ تان کر

قرضہ نہیں دیا ہے تو ہے چھتروں کا بھی ڈر
بھائی! کہیں سے بھی وہ اُگل کھینچ تان کر

آتا نہیں ہے رقص تو آنگن سے مت الجھ
کس نے کہا ہے تجھ سے اُچھل کھینچ تان کر

صد شکر اپنا نام کرپشن میں ٹاپ ہے
کرتے ہیں کوئی اچھا عمل کھینچ تان کر

جاہل ہے اور اس کا شمار افسروں میں ہے
تو بھی اب اُس کے بھیس میں ڈھل کھینچ تان کر

ٹُو رنگے ہاتھ پکڑا گیا ہے تو کیا ہوا
کچھ دے دلا کے بھاگ نکل کھینچ تان کر

سید فہیم الدین

ہاتھ میں لاٹھی پکڑ کر عشق فرمائیں گے کیا
شیخ صاحب آپ عمرِ جاوداں پائیں گے کیا؟

ٹیوشنیں گھر میں پڑھاتے ہیں یہی کافی نہیں
ماسٹر جی! مدرسے میں خاک چھنوائیں گے کیا

ڈاکٹر کی فیس کا سن کر مریضِ محترم
آپریشن ہی سے پہلے کوچ کر جائیں گے کیا

قیمتیں دالوں کی بھی بڑھ جائیں گی سوچا نہ تھا
لوگ دھکوں کے سوا اب اور کچھ کھائیں گے کیا

ہم نے یہ مانا کہ صاحب کو خوشامد سے ہے چڑ
ہم اگر مسکہ لگائیں وہ نہ لگوائیں گے کیا

خواہشِ زر، کینہء دل، غیبت و چغلی، حسد
حضرتِ شیطاں ہمیں کچھ اور بہکائیں گے کیا

مسکراہٹ کے پسِ پردہ تو آنسو ہیں فہیم
کھوکھلے اِن قہقہوں سے خود کو بہلائیں گے کیا

عثمانی بلوچ

رقم لے لے ہزار چُپ ہو جا
اب تو نامہ نگار چُپ ہو جا

اُس کو آنا ہوا تو آئے گا
صاحب انتظار چُپ ہو جا

مان لے میری بات تو مت کر
خود کو شاعر شمار چُپ ہو جا

تم تو پہلے ہی تھوڑی پاگل ہو
کر نہ سوچ و بچار چُپ ہو جا

میں تو بیگم سے ڈرتا رہتا ہوں
دے کے جوتو؟ ں کی مار چُپ ہو جا

میری بیگم کی ہر ادا اچھی
مار بھی شاندار چُپ ہو جا

بات عثمانی کی ذرا سُن لے
آنکھ مجھ کو نہ مار چُپ ہو جا

عثمانی بلوچ

سین سارے ڈراپ ہوتے ہیں
کامراں یا فلاپ ہوتے ہیں

زندگی کر مجھے نہ شرمندہ
کیا کروں، مجھ سے پاپ ہوتے ہیں

کیا ہے تمثیل زندگی تجھ میں
خوبرو ہی جو ٹاپ ہوتے ہیں

رنگ کے کالے تو ہیں نالائق
یہ تو بس روڈ چھاپ ہوتے ہیں

ارتھ پر اب قبول ہیں گورے
کیوں کہ یہ ورک شاپ ہوتے ہیں

اس طرح چھپ چھپا کیدنیا سے
کیوں تمھارے ملاپ ہوتے ھیں

ویسےیہ نام ہیں میاں مجنوں
ماسٹرسب کے باپ ہوتے ہیں

ان پہ جاناں عطا زیادہ ہے
جو یہاں ٹیپ ٹاپ ہوتے ہیں

ڈاکٹر بیدل حیدری

حویلی دل کی خالی ہے؟۔۔۔۔نہیں تو!!
یہ خالی ہونے والی ہے؟۔۔۔۔نہیں تو!!

یہ کیا دھونی رمالی ہے؟۔۔۔۔نہیں تو!!
یہ کیا حالت بنالی ہے؟۔۔۔۔نہیں تو!!

تو کیا اِس دل کی بستی کے علاوہ
کوئی بستی مثالی ہے؟۔۔۔۔نہیں تو!!

میں اپنی نوحہ خوانی خود کروں گا
صفِ ماتم بچھالی ہے؟۔۔۔۔نہیں تو!!

میں کیوں اتنا اچھلتا پھر رہا ہوں
کوئی پگڑی اچھالی ہے؟۔۔۔۔نہیں تو!!

محبت اٹھ نہ جائے۔۔۔۔۔۔خیر مانگو
محبت اٹھنے والی ہے؟۔۔۔۔نہیں تو!!

محمد عاطف مرزا

اگر "شبّو" مِرے ہمراہ چلتی
مِری اولاد اُس کے پاس پلتی
بیاہ کے اُس کو اپنے گھر میں لاتا
"سکینہ" کی جوانی گر نہ ڈھلتی
اُسے میں دوسری بیوی بناتا
"مرینہ" سے اگر بیگم نہ جلتی
دھماکے دار فیشن وہ بھی کرتی
"نذیراں" گر ذرا کڑیوں میں رلتی
اُسے گر شہر کی لگتیں ہوائیں
وہ سینے پر سبھی کے مونگ دلتی
وہ دل کا حال گر کہہ دیتی مجھ سے
نہ لکڑ کی طرح چپ چاپ بلتی
چھڑے چھانٹوں میں میرا نام آتا
مِری اُنگلی میں جو مندری نہ ڈلتی
مجھے بھی نیب والے کچھ نہ کہتے
مِری بیگم نہ گر وہ راز اُگلتی
"مونیکا" گر "کلنٹن" سے نہ پھنستی
تو اُس کی دال میرے ساتھ گلتی
غلط کا گر تلفظ "غلت" ہوتا
صحیح ہو جاتا پھر تو لفظ "غلتی"
یہ کیسا امتحاں ہے مجھ پہ عاطف
مِرے گھر سے نہ اب ہے ساس ٹلتی

روبینہ شاہین بیناؔ

چائے کا اہتمام اور سہی
زندگی تیرے نام اور سہی

آج رستے ہیں بند پنڈی کے
ڈیٹ کا اب مقام اور سہی

میں زباں سے تو کہہ نہیں سکتی
ہاں نظر سے کلام اور سہی

پہلی والی تو میکے بیٹھی ہے
دوسری کا پیام اور سہی

یوں تو دشمن ہوا ہے سارا جہاں
اس میں تیرا بھی نام اور سہی

مونچھ سے تو شریف لگتا ہے
گلو بٹ کا مقام اور سہی

کام کرتی ہے سارا دن بیوی
یوں تو نیل و مرام اور سہی

''میں'' سے آگے تو کچھ نہیں دِکھتا
میم کے بعد لام اور سہی

دل جو کہتا ہے مان لو بیناؔ
عقل و دانش کا کام اور سہی

سید افتخار حیدر

کسی اُستاد سے پہلے غزل لکھوائی جاتی ہے
پھر اُس کے بعد اپنے نام سے چھپوائی جاتی ہے
جو بیگم مار کر سسرال میں پہنچائی جاتی ہے
وہی پاؤں پکڑ کر گھر میں واپس لائی جاتی ہے
مخاطب ہو پڑوسن سے تو فر فر بولتا ہے وہ
ہو بیوی سامنے تو قوتِ گویائی ، جاتی ہے
سخن کی محفلوں میں ہر کوئی اٹھ اٹھ کے تکتا ہے
غزل پڑھنے کو جب اک شاعرہ بلوائی جاتی ہے
میں اس کے حسن کے جھوٹے قصیدے لکھ کے رکھتا ہوں
بیوٹی پارلر جب آپ کی ''بھرجائی '' جاتی ہے
ترے ہونے سے میرے دل کی وحشت اور بڑھتی ہے
تری قربت سے بیگم جی کہاں تنہائی جاتی ہے
محبت اب دلوں کے درمیاں پائی نہیں جاتی
محبت اب سمندر کے کنارے پائی جاتی ہے
عجب حالت بنائی ڈائٹنگ نے اور فیشن نے
کسی ہینگر میں جیسے واسکٹ لٹکائی جاتی ہے
بجائے داد کے دو ہاتھ دینے کو مچلتا ہوں
غزل جب ایک ہی دسویں دفعہ دہرائی جاتی ہے
بظاہر ایک ہے روٹی کراچی اور پشاور میں
وہاں پر کھایا جاتا ہے ،یہاں پر کھائی جاتی ہے

جعفر زٹلی سے جعفر زٹلی تک

روبینہ شاہین بیناؔ

اردو ادب کے نقاد جب بھی اردو کے طنز و مزاح کے گڑھے مُردے اکھیڑتے ہیں تو ان ٹلا کی دوڑ ہمیشہ جعفر زٹلی سے شروع ہوتی ہے۔ جعفر زٹلی نے اُردو میں شگفتہ بیانی اور بذلہ سنجی کی بنیاد رکھی اور اُسے اپنے بنجر عہد میں ایسی توانا نظیر بنایا جس نے بعد ازاں باقاعدہ ایک ہمہ پہلو اظہار کا وسیلہ بننے کی سعادت حاصل کی۔ آج جس قدر مزاحیہ و طنزیہ نثر نگار و شاعر داد و دہش کے سزاوار ٹھہرائے جاتے ہیں وہ جعفر زٹلی کی جودتِ فکر کے مقروض ہیں۔ اردو ادب میں طنز و مزاح میں نہ صرف آفاقی مضامین کو حیطہء تحریر میں لایا جاتا ہے بلکہ جاری و ساری حالات کو بھی اِس خوبصورتی سے بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بھی آفاقی مضامین کا پیرہن پہنتے نظر آتے ہیں' یہی اس کی خوبی ہے جس کی وجہ سے اسے ادبی حلقوں کے ساتھ ساتھ عوام الناس میں بھی پذیرائی حاصل ہوتی ہے۔

میر جعفر زٹلی کے بارے میں تذکرہ نویسوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے اُن کے حالاتِ زندگی پر خاطر خواہ روشنی نہیں پڑتی۔ اُنھوں نے جس پر زور دیا ہے وہ یہی ہے کہ وہ عجوبہء روزگار تھا۔ منہ پھٹ اور شوخ آدمی تھا۔ سخنوری کی بنیاد زیادہ تر "ہزل" پر تھی وغیرہ وغیرہ البتہ مجموعہء نغز سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اُن کا نام میر محمد جعفر تھا' وہ سیّد تھے اور "نارنول" کے رہنے والے تھے۔

میر جعفر زٹلی نے ابتدائی تعلیم اپنے زمانے کے مشہور معلم ابو اسحٰق اطعمہ سے حاصل کی۔ ابو اسحٰق چونکہ خود بھی شاعر تھے اس لئے میر جعفر زٹلی نے اُن سے خاصا اثر قبول کیا۔ میر جعفر اکثر اپنے ہم جماعتیوں کو اپنی چلبلاہٹ اور جودتِ طبع کے نمونے دکھایا کرتے تھے۔

ایک بار مولوی صاحب کی بیوی کو بخار آ گیا' اسی پریشانی میں اُنھوں نے بچوں کے ساتھ خاصی سختی کا مظاہرہ کیا۔ جب وہ پڑھا کر چلے گئے تو بچوں نے میر جعفر سے کہا کہ آج مولوی صاحب کی شان میں کچھ ہو جائے۔ مولوی صاحب کے متاثرین میں چونکہ میر جعفر بھی شامل تھا چنانچہ اُنھوں نے فوراً قلم اٹھایا اور اپنے اُستاد کی شان میں ایک مسدس لکھ ماری جس کا اولین بند کچھ یوں تھا:

ورد پڑھ نادِ علی راکش و پتال کو باندھ — ورد پڑھ نادِ علی جن و گرولال کو باندھ
ورد پڑھ نادِ علی بھیروں و گھڑیال کو باندھ — ورد پڑھ نادِ علی پھولوں کے سریال کو باندھ
ورد پڑھ نادِ علی خرد جال کو باندھ

ہو بید سے باہر تو اُسے چھوڑ کے چل جا — باندھوں کا عبث بھاگ مرے آگے سے ٹل جا
کر اور کسو آدم و حیواں پہ عمل جا — اب آ تو بھی کھا' مان شتابی سے نکل جا
بسم اللہ و الحمد کی برکت سے نکل جا

مولوی صاحب نے جب یہ نظم سُنی تو بہت جزبُز ہوئے اور میر جعفر کو بلا کر کہا کہ تم میرے مکتب سے نکل جاؤ اور لڑکوں کو خراب مت کرو ۔۔۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ بھلے لڑکوں کے ساتھ پڑھو۔ میر جعفر کو ابو اسحٰق کی یہ سرزنش بہت ناگوار گزری یوں اُس کی مکتب کی تعلیمی کیریئر کا خاتمہ ہو گیا۔

اِسی فراغت میں میر جعفر زٹلی نے بہت سی نظمیں تحریر کیں جن میں ایک نظم "کھوانامہ" اس قدر پسند کی گئی کہ اُن کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ اُن کی شہرت شہزادہ کام بخش تک پہنچی تو انہوں نے میر جعفر زٹلی کو بلا بھیجا اور اپنے ہاں مور چھل پر ملازم رکھ لیا۔ اُنہیں دنوں میں اُنہوں نے ایک فرمائشی غزل لکھی جو شہزادہ کام بخش کو بہت پسند آئی۔ وہ غزل کچھ یوں تھی:

اے روئے تو چوں ماہ شب تار جو ہے تو
تجھ سا نہ کہیں دلبر و دلدار جو ہے تو

از غمزہء خونریز تو افتادہ بہر سو
بر طشتِ زمیں کشتہء بسیار جو ہے تو

از عاشق بیچار مکن نخرہ و گھونگھٹ
تا کے بود ایں گرمیء بازار جو ہے تو

تا چند کنی عشوہ بریں رنگ گلابی
یہ رنگ پتنگی سا اُوڑن ہار جو ہے تو

یہی غزل تھی جس نے میر جعفر زٹلی کی زندگی کو لازوال بنا دیا۔ شہزادوں کے ہاں مور چھل کی خدمت خاصا مشقت کا کام ہوا کرتا تھا۔ کچھ عرصہ تو میر جعفر نے صبر سے کام لیا لیکن تا کجے' آخر ایک ہجو لکھی اور شہزادہ کام بخش کی خدمت میں پیش کر دی' اِس کے چند ایک اشعار ذیل میں درج ہیں:

توبہ۔ ازیں وسوسہء مور چھل　　دمبدم از دمدمہء جاں در خلل
توبہ۔ ازیں مسکن روزن فراخ　　روز و شب آوازہء پھُس پھُس چٹاخ

توبہ۔ازیں مسکن پُر شوروشر مرحلہء پُر خلل و خوف و ڈر
خاک در ایں ذیستن وزندگی جاں بہ خلل' دل بہ پراگندگی
روز بہ ہیبت گزروشب بہ ہول خاک درایں ذیستن وفعل وقول
پُر خس وخاشاک۔ بسر نوکری نزد خر بہتر ازیں نوکری
جعفرازیں کوچہء مور چھل شرم حضوری مکن و لوٹ چل

شہزادہ کام بخش کو یہ ہجو بہت ناگوار گزری۔ میر جعفر زٹلی کو خبر ہوئی تو اس نے ایک اور ہجو لکھی اور بغیر کچھ کہے سُنے دکن روانہ ہو گئے۔اس ہجو کا پہلا شعر تھا۔

زہے شاہِ والا گہر کام بخش کہ غچی بزد کر پچی و بخش

وہ عرصہ دراز تک بے روزگار رہے اور اسی دوران بیکاری سے تنگ آکر انہوں نے بہت سی نظمیں لکھیں جس میں سے ایک بہت مشہور ہوئی:

تنہا شدی اندر سفر' کہہ جعفر اب کیسی بنی اُفتادی اندر بحر و بر' کہہ جعفر اب کیسی بنی
در بیکسی تا بودہء بادردو غم آلودہء مفلس شدی ودر بدر ' کہہ جعفر اب کیسی بنی
از ہجو آں سلطان خود کردی پریشاں جان بود درماندہء بے بال وپر' کہہ جعفر اب کیسی بنی
اسبابِ غم برداشتی' تخمِ فلاکت کاشتی اکنوں کجا آں سیم وزر' کہہ جعفر اب کیسی بنی

اسی اثناء میں کو کلتاش خاں جہان خاں ستارہ کی مہم پر گئے۔ میر جعفر نے موقع غنیمت جانا اور ایک رقعہ لکھ کر اُن کی خدمت میں پیش کیا۔اس رقعہ کی ابتداء کچھ یوں تھی:

سبحان اللہ حالِ زمانچہ پُر کٹھن و چلنِ جہاں چہ پُر محن است الخ

میر کو کلتاش اس رقعہ سے بہت متاثر ہوا اور اُسے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔دونوں وقت کا کھانا مل جاتا تھا لیکن کپڑے نہیں دئے جاتے تھے۔ جو کپڑے میر جعفر پہنتے تھے' اُنہیں کو دھو دھو کر پہنتے اور زندگی کے دن گزارتے۔آخر کپڑوں میں جوئیں پڑ گئیں۔عاجز آکر میر جعفر نے یہ عرضی لکھی اور میر کو کلتاش کی خدمت میں پیش کی:

زخانِ جہاں' شاہِ گیتی پناہ زبیداو جوآں زتُل داد خواہ

جوئیں پڑگئیں در قبا و ازار نئی آئی مشکل بہ دلی دیار

دکت کی جوئیں میری پیاسی پھریں کہ حیران ہلکان مجھ کو کریں

لہو میرا پی پی کے موٹی ہوئیں بغل بیچ دشمن مری ہو رہیں

جُواں مارتے مارتے شب گزشت ولے یک جُواں از میاں کم نگشت

اِس عرضی کو پڑھ کر میر کو کلتاش نے توجہ دی اور میر جعفر کو کپڑے ملنے لگے۔

کوکلتاش کو سنگڑہ کی مہم کی فتوحات پر بہت سامالِ غنیمت ہاتھ لگا جس کا کچھ حصہ اُس نے سرکاری خزانے میں جمع کرادیا باقی سپاہیوں میں تقسیم کر دیا۔ جعفر چونکہ سپاہی نہ تھے اس لئے اُن کو کچھ نہ ملا۔ کلتاش کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ کچھ مجھے بھی عنایت کیا جائے۔ اُنھوں نے کہا کہ بھئی تم نے کون سا بہادری کا کام کیا ہے جو حصہ دار بنتے ہو؟ میر جعفر خاموش ہو رہے اور ایک نظم "رستم نامہ" لکھا اور کوکلتاش کی خدمت میں جا کر سنانے لگے:

من آں رُستمِ وقت رویں تنم کہ دہ پاپڑ پختہ را بشکنم

کنم روزن اندر چپاتی بہ تیر بہ آرم دماراز سر مور پیر

کشم گردن پشہ را در کمند مگس چند را من در آرم بہ بند

پوشم اگر جوشن جنگ را ہزیمت دہم پسوئے لنگ را

بصد حملہ بال مگس۔ بر کُنم قطار دو صد مور بر ہم زنم

میر جعفر ابھی اپنی بہادری کی داستان سُنا ہی رہے تھے کہ اچانک خبر آئی کہ مغلیہ سپاہ مخالفین کے ہاتھوں گرفتار ہو رہی ہے۔ کوکلتاش کے ابرو پر بل پڑ گئے۔ اُس نے میر جعفر کو اپنے ہاں سے نکلوادیا۔ میر جعفر نے اِس پر اپنی شان استغناء پر یہ نظم لکھی اور کوکلتاش کو بھجوادی۔

ہزار شکر نہ چوکی نہ پہرہ دارم من نہ از یگانہ و بیگانہ بہرہ دارم من

غریب و بیکس و مسکین و بے نوا ہستم نہ باغ و مملکت و چاہ و کہرہ دارم من

نہ شیشہ و نہ صراحی نہ ساقی و مئے ناب نہ پنگ و حبکہ نہ کونڈی مطہرہ دارم من

نہ گاؤ تکیہ نہ مسند نہ چور چھل نہ رومال نہ بنگلہ او نچانہ تخت کٹہرہ دارم من

نہ شحنہ ام نہ مقدم نہ چوہدری ہستم   نہ ملک و مال نہ دودہ نے مطہرہ دارم من
غریب و بیکس و مسکین و بے نوا ہستم   ہزار شکر کہ نے کبر و زہرہ دارم من
نہ کُنجِ گاہِ عبادت نشستہ ام جعفر   نہ جشنِ عید نہ سیر پہیرہ دارم من

اِس کے بعد ایک نظم نوکری کی بُرائی میں لکھی اور اُسے بھی کوکلتاش کو بھجوا دیا۔ اُس نظم کے چند اشعار کچھ یوں تھے۔

بشنو بیانِ نوکری۔ جب گھانٹھ ہووے کھوکھری
تب بھُول جاوے چوکڑی یہ نوکری کا حظ ہے

ہر روز مجرا اُٹھ کریں در کار یکسو گر پڑیں
بے شرم ایسے لڑ مریں یہ نوکری کا حظ ہے

دس بیس مجرے میں گئے دس بیس بخشی نے لئے
دن بیس جھگڑے میں گئے یہ نوکری کا حظ ہے

کوکلتاش سے علیحدہ ہو کر چونکہ کوئی سہارا نہیں رہا تھا اِس لئے میر جعفر کو واپسی کی سُوجھی۔ واپس آ کر چند روز بعد یوں ہوا کہ اُن کے ایک نوکر اسماعیل نے موقع پا کر گھر کا صفایا کر دیا۔ مرے کو مارے شاہ مدار' فوراً یہ رقعہ لکھ کر کوتوالِ شہر کو بھیجا۔

ظرفہ ادائے و سخت ماجرائے کہ بگفتن عقدۂ کار نکشائد یدِ علی بالخصوص در عین وقتِ بیکاری الخ

کوتوالِ شہر مرزا ذوالفقار بیگ کو رقعہ ملا۔ اس نے کچھ سمجھا' کچھ نہ سمجھا اور چُپ ہو رہا۔ نہ تفتیش کی اور نہ میر جعفر کا حال پوچھا۔ اُن کی یہ بے اعتنائی میر جعفر کو بہت بُری لگی چنانچہ انہوں نے فوراً یہ ہجو اُن کی شان میں لکھی۔

بدیں خصلت و مسکِ نابکار   شدہ خصلتِ میر زا ذوالفقار
نہ ایں ذوالفقار است بہ روئے کار   کنیز است نامش دوا ساز گار
بہر جا کہ باشد چنیں کوتوال   محال است بودن در انجا محال
مبادا چنیں حاکم اندر جہاں   جفا پیشہ خونخوار رہ و سگ دہاں

اس زمانہ میں جعفر کو تواں شہر کی بے مہری اور اپنی مفلسی سے بہت کبیدہ خاطر رہے اور اسی وفورِ رنجیدہ طبعی میں بہت سی رباعیات اور نظمیں تحریر کیں جن میں ایک نظم بہت مشہور ہوئی:

دلاور مفلسی سب سے اکڑ رہ ‌ ‌ ‌ بہ عالم مفلسی سب سے اکڑ رہ
چکن اور زر کا چیرہ پشم کر بوجھ ‌ ‌ ‌ پھٹی پگ باندھ کر سب سے اکڑ رہ
اگر شلوانہ باشد کس کو غم ہے ‌ ‌ ‌ لنگوٹا کھینچ کر سب سے اکڑ رہ
نہ کر خواہش تو جامہ بافتی کا ‌ ‌ ‌ کہن دگلہ پہن سب سے اکڑ رہ
جو کچھ بھی ہاتھ لاگا چھپ چھپا کر ‌ ‌ ‌ خوشی ہو ڈنڈ کر سب سے اکڑ رہ
اگر یہ بھی میسر گر نہ ہووے ‌ ‌ ‌ اکیلا چوں الف سب سے اکڑ رہ

اورنگ زیب دکن کی مہم پر تشریف لے گئے اور متواتر جنگوں کے بعد شاندار فتوحات کے سزاوار ٹھہرے۔ دہلی میں جب اُن کی فتوحات کا چرچا ہوا تو میر جعفر نے یہ "ظفر نامہ" تحریر کیا۔

رہے شاہ اورنگ دہانک بلی
کہ در ملک دکہن پڑی کھلبلی

دریں پیر سالی و صعفِ بدن
مچائی دھما چوکڑی در دکن

برآورد عسکر بصد دھوم دھام
کہ ہلچل پڑی بر سرِ روم و شام

زہے شاہِ شاہاں کہ گاہے دغا
نہ ہلّہ نہ ٹلّہ نہ جنبد نہ جا

کمر بستہ ہشیار میدان پر
شب و روز تیا گھمسان پر

شاہ اور نگ زیب غریب ملا و سپاہی صفت' شعر و شاعری کو کیا سمجھتے' میر جعفر کی پوچھ نہ کی' وہ مایوس ہو گئے اور حسبِ عادت اُن کی ہجو لکھ ماری تاہم کچھ عرصہ بعد جب شاہ اور نگ زیب کا انتقال ہوا تو میر جعفر نے اُن کا مرثیہ لکھا اور کیا خوب لکھا۔

بنال اے عندلیبِ گلشن ہوش
بکن الحان خود از غم فراموش

سیہ کن چہرہ طیب وطربدار
زباں کوتہ بکن بر بندلب را

بکن از تعزیت بال وپر خویش
بزن از نوحہ خاکے بر سرِ خویش

خراش از ناخنِ غم روئے خود را
تراش از درد ماتم موئے خود را

کہ اور نگ زیب عالم گیر دیں دار
گسستہ رشتہء ہستی بناچار

آخری عمر میں اُن کا اندازِ سخن بہت بدل گیا تھا۔ ہزلیات کے بجائے متانت اختیار کر لی تھی۔ اسی زمانے کی اُن کی ایک مشہور رباعی ہے۔

جعفر افسوس عمر ضائع شُد
دو سہ دم خشک را غنیمت دان
خورہء یک روپیہ بآخر باشد
چند پیسہ دگر غنیمت دان

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد اقتدار کے لئے جب اُس کے بیٹوں میں جنگ لڑی گئی تو میر جعفر اس سے بہت کبیدہ خاطر ہوئے۔ خصوصاً شہزادہ فرخ سیر سے کہ جس نے اپنے بہت سے مخالفین کے گلے میں تسمہ ڈال کر انہیں مروایا۔ اِس خوف ناک مظالم کی بھیانک صورتوں (جس میں بہت سے لوگ قتل کروادیے گئے، ان کی زبانیں کاٹ دی گئیں اور انہیں اندھا کر دیا گیا) کو میر جعفر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور دل سے محسوس کیا تھا۔ اس لیے جب فرخ سیر کے نام کا سکہ مسکوک ہوا تو خدا معلوم کس شاعر نے اُس کی تعریف میں یہ شعر لکھا۔

زٹل کے معنی بکواس، جھک اور لغو کے ہیں۔ اس طرح زٹلی کا مطلب بھی بکواسی اور بکی ہوا۔ لیکن جعفر نے کبھی اپنے نام کے آگے زٹلی لگانے میں کوئی حرج نہ سمجھا بلکہ وہ وہ خود زٹل کو اپنے نام کے ساتھ جوڑتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

جعفرا شکر کن کہ در عالم
جا بجا نام تو زٹلی شُد
شہرت مرد بہتر از ہر قسم
ہر کہ گمنام زیست للی شُد

سکہ زد از فضل حق بر سیم وزر پادشاہِ بحر و بر فرخ سیئر

جب یہ شعر جعفر زٹلی کے علم میں آیا تو وہ آپ اپنا دل مسوس کر رہ گیا اور بادشاہ کے رعب، دبدبے سے بے خوف ہو کر اور اعتدال پسندی سے عاری ہو کر اپنے کاٹ دار مزاج سے بادشاہ کی تضحیک میں یہ شعر کہا۔

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر بادشاہِ تسمہ کش فرخ سیر

جعفر زٹلی کا یہ شعر جب منظر عام پر آیا تو عوام نے اس شعر کی خوب پذیرائی کی اور عوام کی یہ پذیرائی ہی جعفر زٹلی کی موت کا سبب بھی بنی۔ کیونکہ بادشاہ وقت کو اس شعر کے دور رس نتائج نظر آنے لگے اور اس نے جعفر زٹلی کی موت کا فرمان جاری کر دیا۔ میر جعفر زٹلی کا سن وفات کیا ہے اس کے متعلق کسی کو کچھ بھی پتہ نہیں تاہم کہا جاتا ہے کہ نواب ذوالفقار خان کو بھی فرخ سیر نے 16 محرم 1125ھ کو تسمہ سے گلا گھونٹ کر مروادیا تھا اسی نسبت سے اُن کے سن وفات کے متعلق بھی اندازہ لگایا گیا ہے۔ جو 1126ھ قیاس کیا جاتا ہے۔

بہت سے لوگ گمان کرتے ہیں کہ جب ولی دکنی کا دیوان آیا تو شمالی ہند میں اُردو میں غزل گوئی کا آغاز ہوا۔ اوّل تو اُردو ادب کا آغاز غزل گوئی سے نہیں ہوا۔ کم و پیش جعفر زٹلی اور ولی دکنی کا دور ایک ہی تھا بلکہ اگر واقعات کے پس منظر میں جھانک کر حقیقت کی جستجو کی جائے تو میر جعفر زٹلی کا دور ولی دکنی سے بھی پرانا ہے اور جعفر زٹلی کا شہرہ ایک نظم گو شاعر کا تھا۔ ہاں البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ولی دکنی اُردو کے اولین صاحبِ دیوان غزل گو شاعر تھے۔

اُردو ادب میں کلامِ میر جعفر زٹلی کی بہت اہمیت ہے۔ اسے بجا طور پر اس امر پر فخر کرنا چاہیئے کہ اسے اپنے نہایت ابتدائے افزائش ہی میں ایسا بے لاگ ' بیباک ' کھرا اور صاف گو شاعر میسر آگیا جس نے اُردو شاعری کو نئے راستے پر گامزن کر دیا۔ آج کی مزاحمتی شاعری میر جعفر زٹلی کی شاعری کا تسلسل ہے تاہم اُس زمانے کی مطلق العنانیت کا اور ہی عالم تھا۔ آج کے جمہوری دور سے قطع نظر اُس وقت واقعی بات کہنے پر زبان کٹتی تھی۔ ایسے میں یہ بیباکی اور بلند گفتاری داد کے قابل ہے۔ میر جعفر زٹلی کو بلاشبہ احتجاجی شاعری کا سب سے بڑا نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ ان کی ایک نظم "دربیانِ دلاوری" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جسمیں کھوکھلی امارت اور سرداری کا نہایت عمدہ پیرائے میں مذاق اڑایا گیا ہے۔ آغاز یہاں سے ہوتا ہے کہ میں رستمِ زمان ہوں اور دس پاپڑ ایک گھونسے سے توڑ سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ مضحک تصویر شائد ہی پیش کی جا سکے۔ شاعر نے ایسے سارے دعوؤں کا مرکز اپنی ذات کو قرار دیا ہے 'لیکن اندازِ بیان کا تیکھا پن فوری طور پر ذہن کو اُس زمانے کے حالات کی طرف منتقل کرتا ہے جس میں سپاہی بے دست و پا ہو کر رہ گئے ہیں اور امراء تیغِ تدبیر سے شیر تصویر کا سر قلم کرنے کے درپے ہیں:

من آں رستمِ وقت روئیں تنم
جہ دہ پاپڑ از مشتِ خود بشکنم

کنم روزن اندر چپاتی بہ تیر
بر آرم دمار از سرِ مورِ پیر

من آنم اگر اسپ جولاں کنم
چہل خانہء موش ویراں کنم

دریں دور ثانیء رستم منم
بتاشہ بہ گرزِ گراں بشکنم

اور پھر اپنے خاص انداز میں کہتا ہے:

تہمتن منم گر کشم تیغ خشم
تراشم بہ دو ضرب تک موے پشم

یعنی بھاری گرز سے بتاشہ توڑ سکتا ہوں اور تلوار کی دو ضرب سے پشم کا ایک بال کاٹ سکتا ہوں۔۔۔۔ کیسی مضحکہ خیز تصویریں ہیں۔

اُن کے کل کلام کے دس فیصدی حصے کو جو فحش اشعار پر مشتمل ہے اُن کی پہچان سمجھا جاتا ہے جو غلط ہے۔ اُن کا نوے فیصد کلام جو اُن کے عہد کا آئینہ دار ہے' کو مدِ نظر رکھا جائے تو اُردو ادب میں اُن کا قد کاٹھ بہت بلند دکھائی دیتا ہے۔

ستارہویں صدی کا نصف آخر اُردو زبان کے ارتقاء کا ابتدائی دور تھا اور اسی دور میں اُردو فارسی کے سحر سے نکل کر اپنے جدا تشخص کا روپ بھر رہی تھی۔ یہی زمانہ جعفر کی نغز گوئی کا دور بھی تھا اور ان کے کلام میں اسی عبوری دور کی تصویر کشی بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔ انہوں نے عمومی قواعد کی روشنی میں فارسی' عربی' ہندی اور دیگر مروجہ زبانوں کے خوبصورت الفاظ کو تراش کر اُردو کو الفاظ کا ایک ایسا ذخیرہ ودیعت کیا ہے جس نے اُن کے ادبی قد کاٹھ کو نمایاں کر دیا ہے۔

میر جعفر زٹلی نے ایک طرف تو اپنے دور کی سماجی و سیاسی حقیقت نگاری سے "شہرِ آشوب" کے لئے راہ ہموار کی تو دوسری طرف وہ ریختہ کا پہلا شاعر تھا جو بیباختگی اور تلخ نوائی کی بناء پر مقتول ہوا۔ آج کے بہت سے شعراء ساری عمر مزاحمتی شاعری کی بغلیں جھانکتے رہے لیکن جب آگ اُن کے در تک آئی تو انہوں نے بیک جنبشِ قلم سرکار کی مدح لکھ کر اپنے منصب کو مضحکہ خیز بنا دیا۔

سودا مشہور ہجو گو شاعر جب لڑکے تھے تو اس وقت میر جعفر معصوم کا بڑھاپا تھا۔ دونوں کے درمیان جو پُر لطف واقعہ ابتدائی ملاقات میں پیش آیا اُسے مولانا آزاد نے آبِ حیات میں خوب لکھا ہے۔

میر جعفر مرحوم سبز رنگ کی جریب ٹیکتے ہوئے ٹہلنے کو نکلے۔ میرزا سودا کتابوں کا جُزدان لئے اُدھر آنکلے۔ حسبِ دستور سودا نے اُنہیں جھک کر سلام کیا۔ میر جعفر نے خوش ہو کر اُنہیں دعا دی۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے چل دیے۔ باتوں ہی باتوں میں میر جعفر نے سودا سے کہا۔۔۔ مرزا! بھلا ایک مصرع پر مصرع تو لگاؤ

لالہ در باغ' داغ چوں دارد

مرزا صاحب بچپن ہی سے خاصی موزونیء طبیعت میں شہرہ رکھتے تھے' کچھ سوچ کر بولے۔

عمر کوتاہ است غم فزوں دارد

میر صاحب نے فرمایا۔۔۔ واہ مرزا۔۔۔ دن بھر کے بھوکے تھے "د" کھا گئے۔ سودا نے پھر کہا

از غمِ عشق سینہ خوں دارد

میر جعفر پھر بولے۔۔۔ واہ بھئی' دل خون ہوتا ہے جگر خون ہوتا ہے' سینہ کیا خوں ہوگا' وہ تو پُر زخوں ہوتا ہے۔ سودا دوبارہ بولے۔۔۔

چہ کند سوزشِ دروں دارد

میر نے کہا۔۔۔ ہاں مصرعہ تو ٹھیک ہے لیکن ذرا طبیعت پر زور دے کر کہو! ۔۔۔ سودا نے جھٹ کہا

یک عصا سبز زیرِ۔۔۔ دارد

میر جعفر مرحوم ہنس پڑے اور جریب اُٹھا کر کہا۔۔۔ واہ میاں! ہم سے بھی ۔۔۔ بتاؤں گا تیرے باپ کو۔۔۔ بازی بازی بریش بابا ہم بازی!

میرزا سودا لڑکے ہی تو تھے۔۔۔ بھاگ کھڑے ہوئے۔

اُن کے کلام میں حق گوئی اور جرأت گوئی کے طنز کی تیزی دیکھئے کہ وہ اپنے وقت کے شہنشاہوں پر بھی طنز کے گہرے وار چلانے نہیں چوکتے اور مصیبت زدہ عوام کی خستہ حالت کا ذکر اس بے باکی سے کرتے ہیں۔

گیا اخلاص عالم سے، عجب یہ دور آیا ہے — ڈرے سب خلق ظالم سے، عجب یہ دور آیا ہے
ہنرمندانِ ہرجائی' پھریں در در بہ سوائی — رذل قوموں کی بن آئی' عجب یہ دور آیا ہے
نفر کی جب طلب ہووے غریب عاجز کھڑا رووے — میاں گھر میں پڑا سووے عجب یہ دور آیا ہے
سپاہی حق نہیں پاویں' نت اٹھ اٹھ چوکیاں جاویں — قرض بنیوں سے لے کھاویں' عجب یہ دور آیا ہے

اِسی طرح وہ سماج کے ان مسائل کو ہدف طنز بناتے ہیں جنھیں ان سے پہلے شعرائے بیان کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کی۔ان کے طنز کا روئے سخن خاص طور پر ان عالم گیر عیوب کی جانب ہے جو اپنے عہد کی تمام حدوں کو پار کر چکے ہیں۔وہ مغرب زدہ مشرقی سماج کی ٹوٹتی پھوٹتی قدروں کو،ان کے اندر آئے انسانی رشتوں کی حرمت وعظمت کی پامالی اور عورت ذات سے رخصت ہوئی شرم وحیا کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہوئے اس طرح لکھتے ہیں۔

نہ یاروں میں رہی یاری نہ بیبو میں وفاداری — محبت اُٹھ گئی ساری، عجب یہ دور آیا ہے
دغل کرتے پھریں دغلی' چغل کرتے پھریں چغلی — شغل کرتے پھریں شغلی، عجب یہ دور آیا ہے
ہنرمندانِ ہرجائی پھریں' دردر بہ رسوائی — رذل قوموں کی بن آئی، عجب یہ دور آیا ہے
نہ بولے راستی کوئی، عمر سب جھوٹ میں کھوئی — اتاری شرم کی لوئی، عجب یہ دور آیا ہے
خوشامد سب کریں زر کی چہ بیگانہ چہ گھر کی — ملادیں بات سب بھر کی، عجب یہ دور آیا ہے
خصم کے جورو اٹھ مارے، گریباں باپ کا پھاڑے — زنوں سے مرد بھی ہارے، عجب یہ دور آیا ہے
جنوں کا کام ہے عاشق' انہوں کا کام ہے فاسق — ہزاروں میں کوئی صادق، عجب یہ دور آیا ہے

چنانچہ سو باتوں کی ایک بات' طنزیہ ومزاحیہ فن میں جعفر زٹلی کا نام اس نقطہ آغاز کے طور پر ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے جس نے برسوں سے چلے آرہے محدود ادبی دائرے کو اپنے طنز کی تیز تلوار سے کاٹ کر اسے وسیع سے وسیع تر بنادیا اور ادبی راہ پر ایسے نقوش چھوڑ دیے جن پر چل کر ہمیں طنز و مزاح کی ایک طویل، صحت مند روایت پروان چڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔

میر جعفر زٹلی کی چند نظمیں

سُن رے بیرا بھائی مورے کھول کہا میں واری تورے

دلی آئے اب دُکھ پایا لابھے کارن مول گنوایا

چہل پوری میں ڈیرہ لیا ایک روپیا بھاڑا دیا

اُستا ہاشم آؤن لاگے جن کے دیکھے ایشور بھاگے

ہاشم قاسم اور بہاری کرنے لگے باتیں پیاری

نورو نے جب کیا پھیرا ہوا کیا گھر کھویا میرا

ہنستے ہنستے نسبت لائی صورت سیرت خوب بتائی

باتوں باتوں لیا لگائے دلدل میں تب دیا پھنسائے

سات پانچ مُل ایکا کیا بھولا منوا میرا لیا

جب میں ڈھل کا کیا قبول کوڑا کرکٹ خاک اور دُھول

قاضی مانگے سوا رپیا کہاں سوں لاؤں میری میا

پنچوں نے مل کیا ٹھکانا جب میں یہ دُکھ لیا بکھانا

تب جا نورو مہندی لائی تا کا حال سنورے بھائی

بیاہ کی رات شہانا گایا عقد پڑھا میں بی بی لایا

گھونگھٹ کھول کیا دیکھوں بیچ دینت بیٹھا گھونگھٹ بیچ

لاکھ روپیا مہر بندھایا ایسا مہنگا دینت پایا

تب تو من میں یہ کر آئی جو ہو دان تو ہوئے بھائی

ایدھر اوودھر دیکھن لاگا دان دیج نہ ایکو تاگا

بیچ بچ میں یہ دلہن پائی کوڑا کرکٹ بھس اور چھائی

کھوسی کھاسی منڈی لنڈی منہ ایسا جوں سانپ کی کنڈی

بنی کے کیا کروں انوپ	جیسے بیجا پور کی توپ
ماتھے کی کیا کروں نشانی	جیسے ہاتھی کی پیشانی
دانتوں کا کیا کروں وچار	جیسے ٹینٹی کا آچار
بالوں کا اب کہوں کیا حال	جیسے خچر کی چھوٹی ایال
منہ کی اب کیا کروں بڑائی	جیسے بیجا پور کی کھائی
بات کہے نہیں آوے بول	جیسے باجے پھُوٹا ڈھول
بیٹھا رہوں میں حجرے بھیتر	جوں پنجرے میں اندھا تیتر
چار پانچ دن بیاہ کو بیتے	بی بی نے تب رہی کیتے
جھگڑا رگڑا آن پسارا	ہونے لاگی مارک مارا
دے دھما دھم ایدھر اودھر	اب مولا میں جاؤں کیدھر
دھکم دھکا تھکم تھکا	دھوس دھاس گھوسم گھاسا
انجر پنجر ٹوٹن لاگے	مروے زندے سوتے جاتے
نورو ! تجھ کو کاٹے کُتا	تیں نے دیا مجھ کو بُتا
نورو ! تیرے پڑیو کیڑے	تجھ کو مکنا ہاتھی چیرے
بجلی ہے یا آگ بگولا	جس سے نام خدا کا بھولا
ہاتھی ہو کر مجھ کو پیلا	چیل جھپٹا مجھ سے کھیلا
رت اُٹھ گھر کے باسن پھوڑے	آگ لگا پانی کو دوڑے
مکر چکر بہت بناوے	چوکی نیچے اونٹ چھپاوے
کھاتی بہت اور کام نہ کرتی	سارے گھر سوں لڑتی پھرتی
کام کرے تو ایسا کرے	چولہے کی ہانڈی کھڈی دھرے
سارا دن جب سوتے گنوائے	نو تیرہ بائیس بتائے
ایسا مجھ کو ناچ نچایا	جیسا کیا تیسا پایا
ایسے جوہر جس کے نال	تو کہے اُس کو کون احوال
جعفر پیارے اب کیا کیجے	تن من دھن تقدیر کو دیجے

کرم لِکھا تھا سو ہی پایا ناحق میں یہ ڈُند مچایا
ڈُند کئے کچھ ہاتھ نہ آوے
صاحب دے سو بندہ پاوے

(نسبت نامۂ جعفر)

تنہا شدی اندر سفر کہہ جعفر اب کیسی بنی
اُفتادی اندر بحر و بر کہہ جعفر اب کیسی بنی

با عشرت و غم ساختی با درد و غم پرداختی
کہ صاحبی و گہ نفر کہہ جعفر اب کیسی بنی

آں دیدنِ شہزادہ کو آں ساقی و آں بادہ کو
کردی خطا خود سر بہ سر کہہ جعفر اب کیسی بنی

فالودہ و فرنی چہ شد پن بھتہ و شرنی چہ شد
اں بستر و بالیں کدھر کہہ جعفر اب کیسی بنی

مرہونِ خار و خس شدی ممنونِ ہر ناکس شدی
کشتی چو سنگِ رہگزر کہہ جعفر اب کیسی بنی

امروز غم ہمراہِ تو با نالۂ جاں کاہ تو
شد در بیابانِ مقر کہہ جعفر اب کیسی بنی

آں پاسبانِ چند کو آں صحبتِ دل بند کو
افتادی اندر رہگزر کہہ جعفر اب کیسی بنی

با بادشہ تیں بیر کی سر پر خدا نے خیر کی
تا حال ہداری خطر کہہ جعفر اب کیسی بنی

وہ ذوق ہر دم کا کہاں وہ عطر بیگم کا کہاں
در خاک شد آں کروفر کہہ جعفر اب کیسی بنی

از لفظِ بے معنی خود ور لاف لایعنی خود
محتاج از ہر خشک و تر کہہ جعفر اب کیسی بنی

وہ مان وہ آدر کہاں وہ لونڈی نادر کہاں
حالا نہ یابی آں وقر کہہ جعفر اب کیسی بنی

با ناز و نعمت بودہ سر بفلک فرسودہ
اکنوں کجا آں بار و بر کہہ جعفر اب کیسی بنی

دل کو ٹھکانے لاؤ اب کرمت پچھتاؤ اب
ہرگز مگو بارِ دگر کہہ جعفر اب کیسی بنی

(حسبِ حال خود گفتہ)

سبھا چند جی تم بڑے ڈھینگ ہو
کہ گز پنگ اور بیل کے شپنگ ہو

کہیں اسپنگ اٹکائے کھڑ کھڑ کرو
کہیں پنکھ پھیلائے پھڑ پھڑ کرو

تجھے دے خدا دزب اندھیر کا
لنڈوری بچھڑ یا ودھڑ شیر کا

دریں چوک جوں غوک ڈگتے رہو — لکوڑوں مکوڑوں کو چگتے رہو
نظر مت کرو سات اور پانچ پر — مبادا پڑے بوجھ اب کانچ پر
کچہری میں ڈنکا کرو سانچ کا — نہ جوں پھُس پٹنگا کرو آنچ کا
ہماری نصیحت رکھو گوش بیچ — جپو رام مالا رہو ہوش بیچ

مجھے خان سیتی ڈراؤ متی
چٹر چیتی اپنی دکاؤ متی

(ہجو سبھا چند)

شنو اے سخن داں برادر عزیز — اٹل بار نولی توئی باتمیز
کتابت فرستادہ بودی رسید — ترا عمر بادا و دولت مزید
اگرچہ منم در زٹل نامور — تو ہم سفتۂ خوب سلکِ گہر
بہ فکرِ دقیقِ تو صد آفریں — بہ تحسینِ تو ساکنانِ زمیں
بہ دیدار تو گشتہ ام بے قرار — ملا دے مجھے اور تجھے کردگار
منم کم تریں بندہ شاگردِ تو — شب و روزِ دریا دو در وردِ تو
کپٹ کھوٹ تیرے سخن میں نہیں — سخن فہم تجھ سا نہ دیکھا کہیں
ہمارا تمہارا اگر ہو ملاپ — تو گاویں خوشی ساتھ باہم ملاپ

بہ دیدارِ تو دل تپیدن گرفت
بہ ہجرِ تو غم سر کشیدن گرفت

(جوابِ رقعہ سید اٹل)

کلر لگا دیوار کو کہ جعفر اب کیا کیجئے — خطرہ ہوا آثار کو کہ جعفر اب کیا کیجئے
کورے گھڑے سب ڈھل گئے ساتھی سنگاتی گھُل گئے — تو بھی دنا دو چار کو کہ جعفر اب کیا کیجئے
اینٹیں پرانی گھِس چلی مائی تمامی رس چلی — کیا دوس ہے معمار کو کہ جعفر اب کیا کیجئے
بُودے ہوئے ہیں چھان بھی اور بان بندھن بانس بھی — کیوں کر رکھوں گھر بار کو کہ جعفر اب کیا کیجئے

برتن بھیا ہے جھوجرا لاگا نکلنے کھوچھڑا | کیا میہنا کمہار کو کہ جعفر اب کیا کیجئے

میں جو پکائے گلگلے وہ ہو گئے ہیں پلپلے | کیوں کر چلوں سسرار کو کہ جعفر اب کیا کیجئے

آئی امڈ دھولی گھٹا تن من لٹا باگا پھٹا | چلنا بڑے بازار کو کہ جعفر اب کیا کیجئے

باگا گلے جوؤں بھرا میلا کچیلا منہ ترا | کس گن ملو گے یار کو کہ جعفر اب کیا کیجئے

رہ مار لاگا گھات میں جاسوس ہے ہر باٹ میں | مشکل بنی بیوپار کو کہ جعفر اب کیا کیجئے

جوبن چلا ہے روس کر گھر بار سارا موس کر | شوبھا نہیں سنکار کو کہ جعفر اب کیا کیجئے

مرکب تو تیرا لنگ ہے کوئی نہ تیرے سنگ ہے | کیوں کر ملو گے یار کو کہ جعفر اب کیا کیجئے

سب کو اسی پل پر گزر بن بوجھ کو اب کیا خطر
تیں تو اُٹھایا بار کو کہ جعفر اب کیا کیجئے

(کلرنامہ)

امریکہ کے کتے

ہم نے دیکھے ہیں وہ یوایس کے نرالے کتے کاٹنے والے نہیں بھونکنے والے کتے
میری محبوبہء مغرب نے بھی پالے کتے میں سنبھالا نہ گیا اس نے سنبھالے کتے

سلسلے پیار کے حیوان سے جوڑے اس نے
میں تو انسان ہوں کتے بھی نہ چھوڑے اس نے

گود میں لے لیا میڈم نے پرایا کتا کبھی چوما ، کبھی آنکھوں سے لگایا کتا
بیٹھتا تھا جہاں شوہر کو ، بٹھایا کتا آیا "ہزبینڈ" تو کہنے لگیں آیا کتا

میں سمجھتا تھا جو ہر دن مجھے مِس کرتی ہے
وہ مرے سامنے "بلڈاگ" کو کِس کرتی ہے

ہر طرف کوچہء دلدار میں ضم کتے ہیں ظلم کوئی بھی ہو اربابِ ستم کتے ہیں
ہم یہ کہتے ہیں امارت کا بھرم کتے ہیں اور کتے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کتے ہیں

ایسے کتوں سے رہو دور ، کنارا کرکے
چھوڑ دیتے ہیں جو انسان کو کتا کرتے

ایک کتے نے کہا میں جو حسیں رہتا ہوں جہاں اے سی کی سہولت ہو وہیں رہتا ہوں
کیوں سمجھتے ہو مجھے خاک نشیں رہتا ہوں میں کوئی تیسری دنیا میں نہیں رہتا ہوں

مجھ کو کھانے میں جو خوراک یہاں ملتی ہے
وہ ترے ملک کے لوگوں کو کہاں ملتی ہے

ہیں مرے شہر کے کتے جو پرانے والے وہ ہیں پنجوں سے مجھے زخم لگانے والے
ٹانگ الفاظ و معانی میں اڑانے والے میری تخلیق کو دانتوں سے چبانے والے

ہر اشاعت پہ مری چونکتے رہ جاتے ہیں
میں گزر جاتا ہوں ، یہ بھونکتے رہ جاتے ہیں

خالد عرفان

نقاد

محفل شعر میں بیٹھے تھے
وہ اکڑے اکڑے
اور بقول ان کے
ادب کے تھے وہ اک طالب علم
میں نے پوچھا
کہ جناب
آپ بھی شاعر ہوئے کیا؟؟
بولے لاحول ولاقوت الا باللہ
ہنس کے پھر میں نے کہا، آپ ہیں افسانہ نگار؟
ترش لہجے میں وہ بولے کہ "نہیں فیصل جی"
میں نے بھی
سرد سے لہجے میں کہا فوراً ہی
آپ لکھتے ہیں ڈرامہ؟
یا کبھی ناول بھی؟
دست بستہ ہوئے گویا کہ مجھے
معاف رکھو
میری تفتیش
ابھی جاری و ساری تھی مگر
مجھ سے وہ کہنے لگے ٹھہرئیے
اک کال ضروری کرلوں
ان کو موبیل پہ یوں کہتے ہوئے میں نے سنا

آپ نے غزلیں جو بھجوائی ہیں ساری
ان کو
شاعری میں تو کسی طور نہیں کہہ سکتا
شعر کے نام پہ، جو آپ نے
لکھ ڈالا ہے
ان کو میں نثر بھی تسلیم نہیں کر سکتا
آپ جیسے ہوں سخن دان اگر کثرت سے
پھر تو
لازم ہے کہ نقاد ہمارے جیسے
زہر کھالیں
یا
کسی نہر میں ہی کود پڑیں
ریلوے کی بھی جو ہو جائے اگر
کل سیدھی
ریل کی پٹڑی پہ ہم بیٹھ کے تنقید لکھیں""

ڈاکٹر عزیز فیصل

رات یوں دل میں۔۔۔

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے گھر میں کوئی لینے کو ادھار آ جائے

جیسے شادی میں چلا آئے کوئی کمی کمیں
جیسے کچرا کوئی لینے کو چمار آ جائے

جیسے بدہضمی معدہ کو بھی مل جائے سکوں
جیسے دو چار برس بعد ڈکار آ جائے

دیکھ کر اُس کی نگاہوں کے کٹوروں میں ذرا
نشہ چھا جائے ہمیں خوب خمار آ جائے

ایسا عالم کہ چونی ہو کسی شیخ کی گم
پہلے یرقان ہو پھر کالا بخار آ جائے

جیسے برتن کہ کھڑکنے لگیں گھر میں یکسر
جیسے بُھولا ہوا کنگال سا یار آ جائے

جیسے اک وجد میں اُس شوخ سے کھا کر تھپڑ
دل کو آرام جوانی کو قرار آ جائے

فیض کی روح کرے جیسے مقدمہ ہم پر
لکھنے والے پہ بھی اللہ کی مار آ جائے

سید فہیم الدین

سیلاب

گِھر گیا ہے ہر کوئی سیلاب میں
ہنس رہی ہے بیکسی سیلاب میں

آنکھ ماری تھی زمیں کو چرخ نے
منہ چھپا کر رہ گئی سیلاب میں

آنسہ باراں کا اسکینڈل بنی
حشر سے وابستگی سیلاب میں

اس قدر بادل کبھی مچلے نہ تھے
کیوں بدل لی تیوری سیلاب میں

ہائے تندریلوں کی غنڈہ گردیاں
چار دیواری چلی سیلاب میں

مٹ گیا فرقِ مکان و لامکاں
چھت مکاں کی گر پڑی سیلاب میں

سارا پاکستان سوئمنگ پول ہے
شوق فرمائیں ابھی سیلاب میں

کچھ بجز لنگوٹ باقی نہ رہا
تیرتا ہے سیٹھ بھی سیلاب میں

ہر کوئی لگتا ہے آبی جانور
خان ہو یا چودھری سیلاب میں

آ گئی بہ حیلہ ریلیف کیمپ
پھر سیاست کلموہی سیلاب میں

پھر رہی ہے لے کے ہیلی کاپٹر
ہر طرح کی لیڈری سیلاب میں

دیر جب فوٹو گرافر کو ہوئی
رک گئی امداد بھی سیلاب میں

ٹھیکیداروں کی تو چاندی ہو گئی
بہہ گئے گھپلے سبھی سیلاب میں

ہم پلنگ پر بیٹھ کر ملنے گئے
وصل کی ٹھہرائی تھی سیلاب میں

-- ق --

صورتِ ملکی معیشت کیا کہوں
کس قدر مریل ہوئی سیلاب میں

چال تھی پہلے ہی کچھوا مارکہ
اور بھی دھوتر بنی سیلاب میں

دل کو کب آتا ہے نچلا بیٹھنا
سوجھتی ہے شاعری سیلاب میں

بہہ گئے گھر بار تو بزمِ سخن
ایک ٹیلے پر جمی سیلاب میں

نوید ظفر کیانی

ایکسرے

دل کا گردے کا جگر کا ایکسرے
لے رہا ہوں ہر بشر کا ایکسرے

ایک بھی بیجا نہیں آیا نظر
لے لیا ہر ایک سر کا ایکسرے

جی میں آتا ہے کہ لے لوں بار بار
آپ کی پتلی کمر کا ایکسرے

جانور ہیں آدمی کوئی نہیں
دیکھ لو سب شہر بھر کا ایکسرے

جو پرندے بھر نہیں سکتے اُڑان
وہ نکالیں بال و پر کا ایکسرے

لے کے آئی ساتھ ہے اپنے خزاں
پھول پتوں کا شجر کا ایکسرے

دل میں تھوڑی سی وفا آئی نظر
میں نے دیکھا جانور کا ایکسرے

اقبال شانہ

آزادی

ہے انہیں پیٹنے کی آزادی
اور ہمیں چیخنے کی آزادی

جب سے شادی ہوئی ہے بیگم کو
مل گئی ڈانٹنے کی آزادی

بولنے کا بھی حق نہیں ہم کو
اور اُنہیں کاٹنے کی آزادی

کیسی دعوت ہے یہ بخیلوں کی
ہے فقط سونگھنے کی آزادی

کیا ہو شاعر کا سامعیں کو اگر
ہو گلہ گھونٹنے کی آزادی

انگلیوں پر نچایئے بے شک
ہو مگر ناچنے کی آزادی

باندھ کر پیٹتے ہیں وہ ہم کو
چھین کر بھاگنے کی آزادی

لیڈروں کو تو مل گئی شانہ
دیش کو لوٹنے کی آزادی

اقبال شانہ

تم بن!

(خواہ مخواہ حور پری بننے والی لڑکیوں کے نام)

خالی مجھ کو "ٹورا" تم نے
لیکن یہ بھی جان رکھو تم
اگلے ہی دن
تم سے زیادہ "سوہنی" لڑکی
میرے جیون میں آئی تھی

سن کر میری پریم کہانی اُس لڑکی نے
اپنا دل مجھ کو دے ڈالا
اور پھر میری " گڈ لک" دیکھو
اس کا ابا مان گیا تھا
منگنی، شادی جھٹ پٹ ہو گئی
کچھ عرصے میں مجھ کو یہ احساس ہوا ہے

تم بن سب کچھ پورا ہے

محمد عاطف مرزا

گرگٹ

کہنے کو تو گرگٹ اک چوپایہ ہے
لیکن سچ پوچھو تو اِس پر کچھ لکھنا
انسانوں پر پر لکھنا ہے

روبینہ شاہین بیناؔ

ارمغان ابتسام میں لکھنے والے